روداد جماعت اسلامی

حصہ دوم

اجتماع دارالاسلام

۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۴۴

ترتیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روداد اجتماع دارالاسلام

حسب اعلان ۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۴۴ کو دارالاسلام (متصل پٹھان کوٹ) میں ارکانِ جماعتِ اسلامی (پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر و بلوچستان) کا اجتماع ہوا، جس میں مرکز کی منظوری سے بعض ہمدردانِ جماعت بھی شریک ہوئے۔ یوپی اور بہار سے جناب مولانا امین احسن اصلاحی (سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ) اور جناب محمد حسنین سیّد صاحب (لہریا سرائے، ضلع دربھنگہ) بھی تشریف لائے تھے۔ تعداد حاضرین تقریباً ۱۵۰ تھی۔

۲۶/ مارچ کو ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک، اور پھر نمازِ ظہر سے نمازِ عصر تک مختلف مقامات سے آنے والے گروہوں نے جناب امیر کے سامنے کھلی ملاقاتوں میں مقامی حالات پیش کیے۔ اپنی اپنی کارگزاریوں کا مختصر تذکرہ کیا، اپنی مشکلات بیان کیں اور ضروری امور میں مشورے حاصل کیے۔ اسی دوران چند اصحاب نے اپنے آپ کو رکنیتِ جماعت کے لیے پیش کیا۔ اس پر جناب امیر نے چند اہم نکات بیان فرمائے جنھیں تسلسل کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے:

''ہمارے یہاں جماعت کی شرکت میں تو کوئی دشواری نہیں ہے، مگر شرکتِ جماعت سے ذمے داریوں کا جو بارِ گراں اٹھانا پڑتا ہے اس کے وزن کو آگے بڑھنے سے پہلے محسوس کر لینا چاہیے۔ رکنیت کی ذمے داریوں کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جو لوگ ہماری طرف بڑھ آئے ہیں وہ نصب العین میں متحد ہونے کے باوجود زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداءً طریقِ کار کے اختلاف پر گہری نظر نہیں ہوتی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ اختلاف ابھرنے لگتا ہے اور لوگ اپنے پسندیدہ طریقِ کار کی محبت کے جوش میں آکر

نظمِ جماعت کی خلاف ورزی کر بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات نصب العین تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ حضرات نے بہت اچھی طرح سے ہمارے طریق کار کو سمجھ لیا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے طریقہ ہائے کار اور ہمارے طریق کار کا فرق ذہن نشین ہو گیا ہو، نیز آپ بہ رضا و رغبت دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر ہمارا طریقِ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہوں تو آیئے، بسم اللہ! ورنہ جلدی نہ کیجیے۔ ہمارے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرتے رہیے اور ہمارے کام کو مزید کچھ عرصہ دیکھ کر آخری رائے قائم کیجیے۔

الحمدللہ کہ مسلمانوں میں ابھی تک صحیح العقیدہ لوگوں کی ایک خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس حق موجود ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ عموماً مختلف گروہ کسی جزوِ حق کو لے کر چل رہے ہیں، بخلاف اس کے ہم پورے حق کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ آپ حضرات کے ساتھ پہلے جو جزوِ حق تھا وہ بدستور ساتھ رہے گا، مگر اس پر اکتفا نہ کیجیے، اب آپ کو دوسرے اجزاءِ حق بھی اس کے ساتھ شامل کر لینے ہیں۔"

اس کے بعد ایک موقع پر طریقِ تبلیغ کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس سلسلے میں جنابِ امیر نے مجملاً یوں اظہارِ خیال کیا:

"جہاں تک تبلیغِ مسلک کا تعلق ہے، عام طور پر مسلمانوں کی جماعتیں تشدد سے کام لیتی ہیں، اور تندیِ جذبات اور مناظرانہ داؤ پیچ اور تیزیِ زبان کے مظاہرہ سے لوگوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے مسلک کی تبلیغ کے لیے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اس معاملے میں بے حد صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ تحریری اور تقریری مناظرے اور بحثیں جو عام طور پر مروّج ہیں ان میں مبلغ غیر محسوس طور پر غضب للنفس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور محسوس تک نہیں کرتا کہ میں خود اپنے محبوب نصب العین کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ رہا ہوں۔ بخلاف اس کے ہمیں ایک ڈاکٹر کی طرح کام کرنا ہے، جو آخر دم تک کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو تندرست ہو جائے۔ اور اگر اسے کاٹ کر جسم سے الگ کرتا ہے تو اس وقت جب کہ وہ دوسری تمام تدابیر کو آزما چکنے کے بعد اس کی علاج پذیری سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سب سے پہلے بیمار عضو کو کاٹ پھینکنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ یہ عوام کا جو انبوہ آپ کے گرد پھیلا ہوا ہے، ان میں سے جو لوگ کفر، شرک یا

فسق کے مریض ہیں ان کا علاج غصہ اور تلخی سے کرنے کے بجائے صبر اور ہمدردی سے کرنا ہے۔ ان بیمار اعضاء کو معاً کاٹ کر نہیں پھینک دینا ہے بلکہ ان پر تمام دوسری تدابیر کو آزما لینا ہے۔

عوام کی معذوری کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان لوگوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد اور رسوم خود مذہبیت ہی کے مقدس دروازے سے داخل ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصلاح کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس مہم کو صبر و تحمل سے سر کیا جا سکتا ہے۔ عرب میں بھی یہی حالات تھے اور وہاں بھی ٹھنڈے طریقوں سے تبلیغ کا کام کیا گیا۔"

پہلی باقاعدہ نشست

پروگرام کے مطابق پہلی نشست اسی روز نمازِ مغرب سے لے کر نماز عشاء سے کچھ پہلے تک جاری رہی۔ اس نشست میں جنابِ امیر نے اپنی تقریر میں جماعت کے کام اور اس سے متعلق ضروری مسائل پر ضروری تبصرہ کیا۔ یہ تبصرہ بلا کم و کاست تھا۔ اس کا مقصد نہ تو مخالفین کو مرعوب کرنا تھا اور نہ رفقاء کے جذبات کو برانگیختہ کرنا مدنظر تھا۔ بلکہ اس تقریر سے جماعت کو اس کے کمزور پہلوؤں پر متوجہ کیا گیا تا کہ لوگ اس کے اصلاح کی فکر کریں۔ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

امیرِ جماعت کی تقریر

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

حضرات! جیسا کہ آپ نے خود بھی اندازہ کیا ہوگا، ہمارے اجتماع کی نوعیت "جلسوں" سے بالکل مختلف ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں زیادہ تر تقریریں ہوتی ہیں، جلوس نکلتے ہیں، نعرے بلند کیے جاتے ہیں، لیکن اس نوعیت کی کوئی چیز یہاں نہ ہوئی نہ کبھی ہوگی۔ ہمارے ان اجتماعات کے انعقاد کی اصل غرض ہنگامہ آرائی نہیں ہے اور نہ توجہاتِ عوام کو اپنی طرف کھینچنا مقصود ہے۔ بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوں، باہم قریب تر ہو جائیں، آپس میں تعاون کی سبیلیں نکالیں۔ صاحب امر آپ سے اور آپ صاحب امر سے شخصاً واقف ہوں۔ اور اسے آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں کا ٹھیک اندازہ ہوتا کہ وہ آپ سے منظّم کام لینے کی کوشش کرے۔ وقتاً فوقتاً ہم اپنا اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیں، اپنی

خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھیں اور انھیں دور کرنے کی فکر کریں۔ اور باہمی مشوروں سے اپنے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچیں۔ غرض ہمارے یہ اجتماعات اپنے اندر عملی روح رکھتے ہیں، ان میں جلسوں کی نوعیت کی کوئی چیز نہ آپ پا سکتے ہیں اور نہ آپ کو پانے کی خواہش کرنی چاہیے۔ اگر ابھی تک جلسہ بازی کی پرانی عادتوں کا کچھ اثر آپ میں موجود ہو، اور ان چیزوں کی کوئی تشنگی آپ اپنے اندر پاتے ہوں تو اسے بھی نکالنے کی کوشش کیجیے۔ ان ہنگاموں میں فی الواقع کچھ نہیں رکھا ہے۔ فضول کاموں میں ذرہ برابر وقت ضائع نہ کیجیے۔ بس کام کی بات کیجیے اور پھر اپنا فرض ادا کرنے میں لگ جایئے۔ آج صبح سے میں مختلف مقامات کی جماعتوں اور اشخاص کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی غیر ضروری باتیں کرنے کی خواہش لوگوں میں عود کر آتی ہے اور بسا اوقات بیان مطابقِ حقیقت نہیں رہتا۔ یہ ایک کمزوری ہے جسے دور کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ جو عادتیں مدتِ دراز سے جڑ پکڑے ہوئے ہیں وہ چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹیں گی۔ مگر انھیں چھوڑنے کی طرف آپ کی توجہ اور سعی ضروری ہے۔

اب تک مختلف مقامات پر جا کر جو کچھ میں نے دیکھا اور باہر کی اطلاعات سے جو اندازہ لگایا اور آج آپ حضرات سے فرداً فرداً و مجتمعاً تبادلۂ خیال کر کے جو معلومات حاصل کیں، ان کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہماری انتہائی احتیاط کے باوجود ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے نظام میں داخل ہو گئی ہے، جسے فی الواقع اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی کے اس فقدان کی نمایاں علامت یہ ہے کہ یہاں اجتماع کے لیے دعوتِ عام دی گئی تھی اور اعلان کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ارکان شریک ہونے کی کوشش کریں۔ مگر بہت سے ارکان کسی عذر معقول کے بغیر نہیں آئے، بلکہ بہت سوں نے عذر پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ لوگوں کے لیے ان کے معمولی کام، روزمرہ کے ان کے مشاغل، ان کے خانگی امور، ان کے دنیوی مفاد اس سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ جماعت کی پکار پر لبیک کہیں۔ اور اسی بنا پر وہ "غیر اولی الضرر" ہونے کے باوجود بیٹھے رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے رفقاء کو اس کام سے حقیقی دلچسپی و وابستگی نہیں ہے۔ اگر فی الواقع وہ جانتے ہوتے کہ یہ اجتماع کیا معنی رکھتا ہے اور جماعت کی پکار سے ان پر کیا لازم آجاتا ہے، اور جو عہد انھوں نے اپنے رب سے کیا ہے اس سے کیا ذمے داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں تو وہ اپنے بڑے سے بڑے دنیوی فائدے اور سخت سے سخت مشغولیت کو بھی

یہاں کی حاضری پر ہرگز ترجیح نہ دیتے۔ جب آج ان کا یہ حال ہے تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ کل کوئی بڑی مہم سامنے ہو اور ہم انھیں پکاریں تو ہماری پکار پر لبیک کہیں گے۔ نظامِ جماعت سے منسلک ہو جانے کے بعد آدمی کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جماعت کی پکار سن کر دوڑ پڑے اور سارے کام چھوڑ دے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ حالات ہیں جن میں خدا اور رسول نے خود رخصت دی ہے۔ ان حالات کے سوا باقی تمام حالات میں جماعت کی شرکت کے لیے دوسری ہر مشغولیت سے قطع نظر کر لینا لازم ہے۔ جب تک ارکانِ جماعت میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی، نظامِ جماعت بالکل بے جان ہوگا۔ کسی کا یہ خیال کر کے بیٹھ جانا کہ اس وقت کوئی خاص کام نہیں ہے، اجتماع کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے، اگر اس وقت میں شریک نہ ہوا تو کوئی نقصان نہ ہوگا، درحقیقت ایک غلط خیال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہاں سرے سے کوئی کام نہ ہوتا بلکہ آپ کو صرف جمع ہو جانے کے لیے پکارا جاتا، تب بھی آپ کو ایک آواز پر جمع ہو جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس ابتدائی مرحلہ میں یہی بجائے خود ایک اہم کام ہے کہ آپ کے اندر ایک آواز پر جمع ہو جانے کی استعداد پیدا ہو۔ اس ڈسپلن کے بغیر آپ کون سا کام تنظیم اور تعاون کے ساتھ کر سکیں گے؟

یہ سرد مہری جس کا اظہار اس اجتماع کے موقع پر ہوا ہے، کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے جو اس وقت رونما ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعت کے بعض یا اکثر ارکان ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہیں ہوتے، یا شریک ہوتے ہیں تو التزام کے ساتھ نہیں، بلکہ گنڈے دار طریقے سے کہ جب دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی مشغولیت انھیں نہ ہوئی اور تفریح کو بھی جی چاہا تو مقامی جماعت کے اجتماع میں آگئے۔ بعض مقامات پر تو ہفتہ وار اجتماع کا قاعدہ ہی سرے سے منسوخ کر دیا گیا ہے اور بہت سے ارکان ایسے بھی ہیں جو جماعت میں داخل ہونے اور جان بوجھ کر خدا سے عہد غلامی تازہ کرنے کے بعد ویسے ہی ٹھنڈے، بے روح اور جامد و ساکن ہیں جیسے اس سے پہلے تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کوئی تغیر ہوا، نہ جاہلیت کے ماحول سے ان کی کوئی جنگ ٹھنی، نہ دعوت الی اللہ کے لیے کوئی سرگرمی ان میں پیدا ہوئی اور نہ ہم سفر رفیقوں کے ساتھ کوئی وابستگی ان کے اندر پائی گئی۔ حالانکہ ہم نے ابتداء میں جماعت قائم کرتے وقت بھی کہہ دیا تھا اور اس کے بعد بھی بار بار کہتے رہے ہیں کہ ہمیں کثرتِ تعداد کی نمائش کرنے کے لیے ارکان کی فضول بھرتی نہیں کرنی ہے۔ ہمیں وہ فربہی مطلوب نہیں ہے جو جسم کو طاقت ور بنانے کے

بجائے الٹا بوجھل بنادے۔ ہمیں صرف ان لوگوں کی ضرورت ہے جنھیں فی الواقع کچھ کرنا ہے اور جو کسی خارجہ دباؤ سے نہیں بلکہ اپنے ایمان کے اندرونی تقاضے سے خدا کے دین کو قائم کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان پے در پے تصریحات کے باوجود اس قسم کے لوگ ہمارے اس نظام میں بھی داخل ہو گئے جو اس سے پہلے محض مسلمانوں کے گروہ سے متعلق ہونے ہی کو نجات کے لیے کافی سمجھ لینے کے عادی رہے ہیں۔ ان سے میں عرض کروں گا کہ اگر آپ کو یہی کچھ کرنا تھا تو اس غریب جماعت کو خراب کرنا کیا ضرور تھا۔ آپ کو اگر فی الواقع اس نصب العین سے ہمدردی تھی جس کی خدمت کے لیے یہ جماعت بنی ہے اور اسی ہمدردی نے آپ کو ہم سے تعلق پیدا کرنے پر آمادہ کیا تھا، تو آپ کی ہمدردی کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ اس جماعت کو خراب کرنے سے پرہیز کرتے اور وہ بیماریاں اسے نہ لگاتے جن کی وجہ سے مسلمان مدت ہائے دراز سے کوئی صحیح کام نہیں کر سکے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال کے دوران میں متعدد اصحاب ہمارے نظامِ جماعت سے الگ ہوئے ہیں اور ایک دو مستثنیات کے سوا تقریباً سب کے اندر اس علیٰحدگی نے رجعتِ قہقری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آپ جانتے ہیں اور جو شخص بھی ہمارے طریقِ کار سے واقف ہے اس بات کو جانتا ہے کہ ہم نے جماعت میں لینے سے پہلے ہر شخص کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا ہے۔ دین کو اور اس کے مقتضیات اور مطالبات کو، اپنے مقصد کو اور اس کے حصول کے طریقے کو اچھی طرح کھول کر بیان کیا ہے۔ پھر داخلۂ جماعت کے موقع پر بھی ایک ایک شخص کے سامنے واضح طور پر ان ذمے داریوں کو پیش کر دیا ہے جو توحید و رسالت کے شعوری اقرار سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اس تصریح کے بعد ہر امیدوارِ رکنیت سے دریافت کر لیا ہے کہ آیا وہ اس اقرار کے وزن کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے بہ رضا و رغبت یہ بار اٹھانے کے لیے تیار ہے؟ اس طرح ہر اشتباہ و التباس اور ہر غلط فہمی کے بغیر جن لوگوں نے اقرار کیا صرف وہی جماعت میں لیے گئے۔ ایسے سوچے سمجھے اور جچے تلے اقرار کے بعد نظام جماعت سے کسی شخص کے الگ ہونے کی اگر کوئی معقول صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ وہ ہم میں نفاق کی بو محسوس کر کے، یا ہمارے نظام میں کوئی ناقابلِ علاج کمزوری پا کر ہم سے الگ ہوتا اور پھر ہم سے زیادہ بہتر طریقہ سے، زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرتا، جس کو

اس نے خوب ٹھنڈے دل سے جان بوجھ کر اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا اور اس صورت میں بعید نہ تھا کہ اس کو اپنے سے آگے پا کر ہم خود اس سے جا ملتے۔ لیکن یہاں جو صورت حال دیکھنے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں نے پورے شعور کے ساتھ، جلد بازی میں نہیں، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر، ہم سے نہیں بلکہ اپنے خدا سے اقرار کیا تھا، وہ جماعت سے الگ ہوئے اور الگ ہو کر ان میں سے بعض ساکن و جامد ہو گئے۔ بعض ان گروہوں کی طرف پلٹ گئے جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ ان کے طریقوں کو غلط پا کر اور ان سے مایوس ہو کر وہ "علیٰ وجہ البصیرت" ادھر آئے ہیں اور بعض ظالم تو ایسے پلٹے کہ جو دین داری اور پابندیِ شریعت انھوں نے اختیار کی تھی اور اخلاقی اصلاح کے جو اثرات قبول کیے تھے، ان کے بیشتر حصہ پر خطِ نسخ پھیر دیا اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیا جو پہلے کرتے تھے۔ بعض اصحاب کے اندر رجعت کی شدت کا یہ حال دیکھ رہا ہوں کہ نماز تک کے تارک ہو گئے ہیں۔ جن حرام چیزوں سے پرہیز کرنے لگے تھے ان میں پہلے سے بھی کچھ زیادہ مبتلا ہو رہے ہیں، اور معروف اخلاقی ذمے داریوں تک سے بے پروا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ ان حالات کو دیکھ کر مجھے کس قدر رنج ہوتا ہے۔

ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان سرد مہریوں، ان عہد فراموشیوں اور ان رجعتوں کے اسباب کیا ہیں؟ میرے نزدیک پہلی اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ جس قوم میں کام کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں، صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اس کے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ان میں کیرکٹر کی وہ طاقت بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے جس کی مضبوط چٹان پر اٹل فیصلے، مستقل ارادے، ثابت عزائم اور بھروسے کے قابل عہد و میثاق قائم ہوتے ہیں۔ اس میں مدت ہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اسے حق مانیں، مگر اس کے لیے کوئی قربانی گوارا نہ کریں، نہ وقت کی، نہ مال کی، نہ خواہشاتِ نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انھیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لیے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو۔ اور اس کے بعد انھیں اس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار، اپنے ادارے اور اپنی زندگی کے سارے معاملات چلانے کی پوری آزادی حاصل رہے اسی لیے وہ نام نہاد مذہبیت کے ان راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دین داری اور

سعی و عمل کا سارا دارومدار اسلام اور جاہلیت کی مصالحت (Compromise) پر ہے۔ لیکن ایسی حق پرستی ان کے لیے ایک ناقابلِ تحمل بار گراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و بغاوت کے درمیان دوٹوک فیصلہ چاہتی ہو اور جس میں ہر اس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے، پہلا مطالبہ یہ ہو کہ وہ یکسو ہو جائے، اور پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو اس نے حق مانا ہے اس کے لیے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لیے تج دے۔ وقت کی، مال کی، خواہشاتِ نفس کی، مرغوبات اور دلچسپیوں کی، امنگوں اور تمناؤں کی، توقعات اور امیدوں کی، گھرے سے گھرے تعلقات کی، قوتوں اور قابلیتوں کی، غرض ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے۔ اور ایک دو دن کے لیے نہیں، چار چھ مہینوں کے لیے نہیں، کسی مقررہ مدت کے لیے نہیں، بلکہ جب تک جینا ہے اس وقت تک گوارا کرتا رہے۔ آپ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے مسلمان بہت پا سکتے ہیں جو خوشی خوشی جان دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے، سینے پر گولیاں کھالیں گے، سروں پر لاٹھیوں کی بارش سہہ لیں گے، جیل کی سختیاں برداشت کرلیں گے، یہ سب ان کے لیے چھوٹے اور ہلکے کام ہیں جنھیں یہ بہ آسانی برداشت کرلیں گے، لیکن اپنی پوری زندگی کو ایک ضابطہ میں کس دینا، عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے صبر سے کام کیے جانا، جیتے جی اپنی خواہشات پر ایک بریک لگائے رکھنا، اپنی عادتوں اور ذہنیتوں کو بدل ڈالنا اور کسی خارجی دباؤ کے بغیر اخلاقی ذمے داریوں کو قبول کرنا اور نباہنا، یہ فی الحقیقت ان کی برداشت سے بہت زیادہ بھاری بوجھ ہے جس کی سہار ان کے لیے سخت دشوار ہے۔ یہ نمائشی ہنگاموں میں ایک عمر گزار سکتے ہیں مگر کسی ایثار طلب عہد کو سال دو سال بھی بمشکل نباہ سکتے ہیں۔ ان کے ارادے کمزور ہو چکے ہیں، ان کی قوتِ فیصلہ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ان میں عادات و خواہشات کے انضباط اور اعتقاد و عمل کی مطابقت اور کسی نظام کی پابندی میں مسلسل کام کرنے کی قوت باقی نہیں رہی ہے۔ ان کی مثال اس جنگلی گھوڑے کی سی ہے جو روزِ پیدائش سے آزاد پھرنے کا عادی رہا ہو اور کسی گاڑی میں جُت کر ایک مقرر راستے پر سیدھا چلنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے گھوڑے کو اگر کسی طرح رام کر کے باندھ بھی لیا جائے تو بہت جلدی وہ بندشوں سے اکتانے لگتا ہے، حتیٰ کہ ایک دن رسّی تڑا کر ایسا بھاگتا ہے کہ پہلے سے بھی زیادہ دور نکل جاتا ہے۔

دوسری بنیادی کمزوری جسے میں روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا جارہا ہوں،

یہ ہے کہ ہمارے عوام تو دین کے فہم اور اس کی روح کے ادراک سے محروم ہیں ہی، مگر ہمارے درمیان جو لوگ مذہبی میلان رکھنے والے ہیں وہ اس معاملہ میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ مخلص اور نیک نیت لوگوں تک کا یہ حال ہے کہ وہ دین داری اور فن دین داری اور پیشۂ دین داری کے فرق کو نہیں جانتے۔ دین کی حقیقی قدروں کو انھوں نے دوسری قدروں سے بدل لیا ہے یا خلط ملط کر لیا ہے۔ جو چیزیں دین میں نہایت اہم ہیں بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہیں وہ ان کی نگاہ میں، ہماری تمام کوششوں کے باوجود محض ایک ضمنی اہمیت حاصل کر سکی ہیں کیونکہ ایک طویل مدت کی تعلیم و تلقین سے ان کا اندازِ فکر کچھ ایسا ہی بنا دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے جو چیزیں دین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی یا کسی قدر رکھتی بھی ہیں تو محض ایک ضمنی اہمیت، وہی ان کے نزدیک مدارِ دین ہیں۔ کیونکہ فن دین داری اور پیشۂ دین داری نے ان کو یہی مرتبہ دیا ہے۔ عالم ہوں یا عامی یا متوسطین، بہر حال ان کے درمیان کم ہی ایسے شخص پائے جاتے ہیں جو صحیح دینی بصیرت کی بنا پر جانتے ہوں کہ خدا کے دین میں کون سی چیزیں کس درجہ میں مطلوب ہیں، کس کس چیز پر کتنا زور دینا چاہیے اور کون سی چیز کس چیز کی خاطر چھوڑی جا سکتی ہے۔ یہ اختلاف جو قدروں کے تناسب میں ہمارے اور عام مذہبی میلان رکھنے والے لوگوں کے درمیان موجود ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بھی بہت سی سرد مہریوں اور رجعتوں کا سبب ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں کہ دین کو خوب جان کر اور سمجھ کر ہم نے اقامتِ دین کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا ہے اس کے ساتھ ہم بے وفائی نہیں کر سکتے اور اگر لوگوں میں سرگرمی پیدا کرنا یا پلٹنے والوں کو رجعت سے باز رکھنا اسی پر موقوف ہے کہ دینی قدروں کے حقیقی تناسب کو بدل دیا جائے، تو نہ ہمیں ایسی سرگرمی مطلوب ہے اور نہ کسی پلٹنے والے کی بازگشت کَائِنًا مَنْ کَانَ۔

ایک اور اصولی سبب ان رجعتوں اور سرد مہریوں کا یہ ہے کہ بہت سے لوگ جماعت کی رکنیت اور عام انجمنوں اور پارٹیوں کی رکنیت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ انھوں نے ابھی پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے کہ اس جماعت کی شرکت کیا معنی رکھتی ہے۔ وہ ابھی تک اس گمان میں ہیں کہ یہ بھی کوئی انجمن ہے جس میں کسی ادنیٰ وجہِ کشش کی بنا پر شامل ہو جانا اور شامل ہو کر دلچسپی نہ لینا اور پھر کسی چھوٹی یا بڑی وجہِ ناپسندیدگی کی بنا پر الگ ہو جانا، آدمی کے دین و ایمان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ حالانکہ فی الحقیقت اس جماعت کی نوعیت عام انجمنوں اور پارٹیوں کی نوعیت

سے بالکل مختلف ہے۔ یہ جماعت خالصتاً دینِ حق کی اقامت کے لیے قائم ہوئی ہے۔ اس کا نصب العین وہی ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس میں داخل ہوتے وقت ہر شخص سے پورے شعور کے ساتھ وہی عہد لیا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں معاملۂ بیع سے تعبیر فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

(التوبہ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اوران کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

ایسی جماعت میں داخل ہونے کا جو شخص ارادہ کرے، اسے پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا فی الحقیقت اس کی یہی غرض اور یہی نوعیت ہے اور یہی کام اس کے پیش نظر ہے؟ اگر تحقیق سے اس کو ان امور پر اطمینان حاصل نہ ہو تو سرے سے جماعت کی شرکت ہی غلط ہے۔ لیکن اگر اسے اطمینان حاصل ہو جائے اور وہ یہ یقین رکھتے ہوئے داخلِ جماعت ہو کہ اس جماعت کی غرض وغایت یہی ہے جو دستور میں بیان کی گئی ہے اوراس یقین کی بنا پر وہ اللہ سے خوب سوچ سمجھ کر بیع کا معاہدہ کرے تو اس کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی شرکت اور ایسے معاہدۂ بیع کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہوسکتی کہ ایک کوٹ ہے جسے جب چاہا پہنا اور جب چاہا اتار دیا۔ ادھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کی کشتیاں جلا دیجیے۔ یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھیے کہ اب پلٹ کر جانے کے لیے کوئی جگہ آپ کے لیے نہیں ہے۔ خدا سے عہد باندھنے کے بعد جس جان و مال کو آپ بیچ چکے اب آپ اسے واپس نہیں لے سکتے۔ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آپ سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں۔ اب آپ کو جان لڑا کر یہ کام کرنا ہے، خود اس راہ پر چلنا ہے اور دوسروں کو چلانا ہے۔ کوئی خرابی رونما ہوتی نظر آئے تو بھاگنے کی فکر نہ کیجیے بلکہ کم از کم اسی جذبہ کے ساتھ اسے دور کرنے کی فکر کیجیے، جس طرح آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کی فکر کریں گے۔ آگے والا اگر نہ چلے تو پیچھے سے سرک نہ جایئے بلکہ اسے یا تو چلنے پر مجبور کیجیے یا اسے ہٹا کر پھینک دیجیے اور خود آگے بڑھیے۔ یہاں آ کر اگر آپ اس کام میں دلچسپی نہ لیں گے، یا وقت، مال، محنت اور دل ودماغ اور جسم وجان کی قوتیں اس راہ میں صرف کرنے سے جی چرائیں گے یا دوسرے

کاموں کو اس کام پر ترجیح دیں گے تو اپنے خدا سے بے وفائی کریں گے، آپ کا عہد کسی انسان سے نہیں، خدا سے ہے۔ شرکت کے وقت جو عہد آپ نے کیا ہے اس کے ساتھ ہی آپ اپنا سب کچھ اور خود اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اب آپ کی ہر چیز پر پہلا اور مقدم حق خدا اور اس کے کام کا ہے، باقی تمام چیزیں اس سے موخر ہیں۔

یہ ساری باتیں میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس کام کی عظمت کو اچھی طرح محسوس کرلیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مجھ سے اکثر تقاضے ہوتے رہتے ہیں کہ تم جلدی سے کوئی بڑا اقدام کر ڈالو۔ لیکن ابھی میں نے جن کمزوریوں کا ذکر آپ کے سامنے کیا ہے ان کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود اگر میں کوئی بڑا اقدام کر بیٹھوں تو مجھ سے بڑا نادان کوئی نہ ہوگا۔ سیرت واخلاق کی ان خامیوں اور فہم ونظر کی ان کوتاہیوں کے ساتھ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔ کجا کہ وہ کام جو دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ دنیا کے نظامِ زندگی میں جو ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنا ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے ایک اور ہی قسم کی ذہنیت اور سیرت درکار ہے، جسے ڈھالنے اور تیار کرنے کا کوئی انتظام ہمارے یہاں ایک مدتِ دراز سے نہیں ہوا ہے۔ جو سانچے ہمارے یہاں مدتوں سے بنے ہوئے ہیں وہ اخلاق وعادات اور ذہنیتوں اور سیرتوں کو کسی اور ڈھنگ پر ڈھالتے رہتے ہیں، جو اس کام کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ قبل اس کے کہ ہم اپنے پیش نظر کام کی طرف کوئی بڑا قدم اٹھائیں ہمیں ان بوسیدہ سانچوں کو توڑنا ہے اور نہایت صبر کے ساتھ پیہم سعی دجہد سے نئی سیرتیں، نئی ذہنیتیں، نئی عادتیں اور نئی اخلاقی صفات پیدا کرنی ہیں جو حقیقتاً نئی نہیں بلکہ سب کی سب پرانی ہیں مگر بدقسمتی سے آج ہمارے لیے نئی ہوگئی ہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ کسی فاسد اور مفسد گروہ کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنی زمین کے انتظام اور اپنی خلق کی امامت وپیشوائی کے منصب پر قابض نہیں ہونے دیتا جب تک دنیا ایک صالح و مصلح گروہ (منتشر افراد نہیں بلکہ منظّم گروہ) سے بالکل ہی خالی نہ ہوجائے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق قیادت ورہنمائی کے منصب اور زمین کے انتظام میں کوئی اصولی تغیر بھی اس وقت تک واقع نہیں ہوسکتا جب تک ایک امتِ وسط، ایک خیر امت وجود میں نہ آجائے، جو شہداء علی الناس ہونے کے لائق ہو، جس کا جینا اور مرنا خالص اللہ اور اس کے دین کے لیے ہو اور جو اپنی اِخلاقی صفات کے اعتبار سے تمام دنیا کی امتوں پر فوقیت رکھتی ہو۔

اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا، جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے، کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزا باطل کی آمیزش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزا باطل کی آمیزش کے ساتھ آتے ہیں، ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے، اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے، تو اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو، جو امتِ مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے، یا نہیں تو اُسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دوٹوک فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اٹھنے تک دیکھتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخر کار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ لیکن اگر مسلمان حق سے منہ موڑیں اور اپنے مقصدِ وجود کی طرف صحیح دعوت کو سن کر الٹے پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندستان میں اٹھ چکی ہے اس لیے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لیے تو آزمائش کا وہ خوف ناک لمحہ آ ہی گیا ہے، رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے ممکن ہے کہ ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لیے مقدر ہوں، لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت

صرف دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس وتشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا، اکابرِ امّت اور علماء ومشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا یا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اتر آنا اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکتے جھجکتے اور پس وپیش کرتے ہوئے بڑھنا، میرے نزدیک ایک نہایت بُری علامت ہے۔ اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے۔ خوب جان لیجیے کہ اگر اس وقت اس قوم میں سے کچھ آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اُمت وسط اور شہداء اللہ بننے کے قابل ہوں اور وہ خدمت انجام دے سکیں، جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر ایک صالح و مصلح گروہ کو کمر بستہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ (المائدہ: ۵۴)

”بعید نہیں کہ اللہ کسی دوسری ایسی قوم کو لے آئے جو اللہ کو محبوب ہو اور اللہ اُسے محبوب ہو، جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہو، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے اللہ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور علیم ہے۔“

آپ حضرات یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ آپ دراصل اُمتِ وسط بننے کے امیدوار ہیں۔ آپ کا مقصود یہ ہے کہ اس مقامِ بلند کو حاصل کریں۔ اتنے بڑے منصب کی امیدواری کے لیے اٹھ کھڑا ہونا پھر نہ اس کی عظمت کو محسوس کرنا، نہ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا، ایک عظیم الشان بے خبری ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بے خبری یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ ان کم سے کم صفات سے بھی ابھی تک متصف نہ ہوئے ہوں جو اس کارِ عظیم کے لیے ضروری ہیں

اور دوسری طرف آپ تقاضا کریں کہ فوراً ہی کوئی بڑ قدم اٹھا دیا جائے۔ کیا آپ اتنا نہیں سمجھتے اور اس سے ڈرتے نہیں کہ اگر آپ نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس کے لیے ضروری استعداد آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی ہے تو آپ منہ کی کھا کر پسپا ہوں گے اور اس رہ میں پیچھے ہٹنا فرار من الزحف ہے، جو خدا کی شریعت میں بہت بڑا گناہ ہے۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے لیے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ یہ صفات تین اقسام پر منقسم ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو شخصی حیثیت سے انفرادی طور پر ہونی چاہئیں۔ دوسری وہ جو ایک صالح جماعت بنانے کے لیے ضروری ہیں اور تیسری وہ جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے ناگزیر ہیں۔

شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور اللہ کا مطیع فرمان بنائے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله (مسند احمد ۶/۲۱،۲۲)

”حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے۔“

یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لیے نکلیں، اس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لیے تباہ کن ہے۔ پہلے خود خدا کے آگے سر جھکائیے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجیے۔

جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑنا نہیں ہے بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے۔ اصل مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کے وطن میں قانون الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرماں برداری ہی اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔ یہ

حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کردی گئی ہے، بطور مثال ایک حدیث کو لیجیے۔ آنحضورؐ سے پوچھا گیا:

ما الهجرة افضل يا رسول الله "یارسول اللہ! کون سی ہجرت افضل ہے؟"

جواب ملا:

ان تهجر ما كره ربك (نسائی، کتاب البیعۃ، باب ہجرۃ البادی)

"یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔"

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترکِ وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیے اور اصطلاحی کفّار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنائیے۔ اس معنی کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حدیثِ نبوی کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنائیے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور خواہ کتنا ہی گھومے پھرے بہر حال اس حد سے آگے نہیں جا سکتا، جہاں تک رسی اسے جانے دیتی ہے: **مثل المومن ومثل الايمان كمثل الفرس فى اٰخيته يحول ثم يرجع الى اٰخيته۔** (مسند احمد ۳/۵۵) ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے ساتھ دوسرا قدم یہ اٹھائیے کہ اپنے قریبی ماحول سے جسے میں Home Front کہوں گا، لڑنا شروع کر دیجیے، گھر کے لوگ، اعزہ، دوست اور سوسائٹی جس سے آپ کا گہرا ربط ہے ان سب سے ایک عملی کشمکش شروع ہو جانی چاہیے۔ کشمکش اس معنی میں نہیں کہ آپ اپنے متعلقین سے کشتی لڑیں، یا ان سے تو تو، میں میں اور مناظرہ شروع کر دیں۔ بلکہ یہ کشمکش اس معنی میں ہونی چاہیے کہ آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دل دادہ اور اپنے اصول وضوابط کے اتنے پابند ہو جائیں کہ گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین

کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کررہے ہیں وہ آپ کی پابندِ اصول زندگی کو گوارہ نہ کرسکیں۔ آپ کی بیویاں، آپ کی اولادیں، آپ کے والدین، آپ کے رشتے دار اور دوست آپ کے رویہ کے خلاف مزاحمت کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ آپ اپنے شہر میں اجنبی ہوکررہ جائیں، جہاں آپ کسبِ معاش کے لیے کام کرتے ہوں وہاں آپ کا وجود نمایاں طور پر کھٹکنے لگے، دفتر کی آرام کرسی جس پر بیٹھ کر جاہ وترقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں، آپ کے لیے انگاروں کی انگیٹھی بن کررہ جائے۔ غرض جو جتنا زیادہ قریبی ہو اس سے اتنا ہی پہلے تصادم شروع ہونا چاہیے۔ جس شخص کے گھر میں میدانِ جہاد موجود ہو وہ آخر چند میل کے فاصلہ ہی پر کیوں لڑنے جائے، پہلا معرکہ تو گھر ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ اب تک جہاں جہاں سے اس کشمکش کی اطلاعات آرہی ہیں وہاں کے لوگوں سے میں مطمئن ہورہا ہوں، اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آرہی ہیں وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔

مگر میں بروقت یہ واضح کردوں کہ یہ ساری کشمکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے کہ جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے، اور اس کی تمام تر جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر اخلاص ہوتا ہے دشمنی نہیں ہوتی ہے۔ اس کی نفرت اور اس کا غصہ بالکلیہ مرض کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ مریض کے خلاف۔ بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لائیے، وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیر سے دیکھا جارہا ہے، یا براہ راست اس کی ذات سے دشمنی کی جارہی ہے، بلکہ وہ آپ کے اندر انسانی ہمدردی، محبت اور اخوت کو کام کرتا ہوا پائے۔ میں نے اجتماعِ دربھنگہ کے موقع پر بھی مختصراً یہ کہا تھا کہ اصلی تبلیغ تقریروں اور تحریری مناظروں سے نہیں ہوا کرتی، یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنیٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور اور نمونہ ہوں، جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے یہ نمونے گزر جائیں وہ آپ کے طرزِ عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کے راہ کے راہی۔ جس طرح کوئی ''فنافی الکانگریس'' آدمی سامنے آتا ہے تو کانگریسیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اسی طرح آپ ایسے

فنافی الاسلام بن جایئے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اذا رؤا ذکر اللّٰہ (ابن ماجہ، ابواب الزھد) ’’جب ان پر نگاہیں پڑیں تو اللہ یاد آجائے۔‘‘

میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا فوراً ہو جانا چاہیے۔ یہ مقام تو تدریجاً ہی حاصل ہوگا، خدا کی راہ میں جب اپنے ماحول سے پیہم آپ کا تصادم ہوتا رہے گا اور آپ ہر آن، ہر لمحہ اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے ہوئے قربانیاں کرتے رہیں گے، تو ایک مدت میں جا کر فنائیت کی کیفیت آپ پر طاری ہوگی، اور آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور بن سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے قرآن و حدیث کو بہ امعانِ نظر بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرز کے آدمی تیار کیا کرتے تھے، وہ کیا صفات تھیں جو اس تحریک کے کارکنوں میں پہلے پیدا کی گئیں اور اس کے بعد جہاد کا علم بلند کیا گیا۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے مزکیّ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو انسان تیار کیے تھے انھیں پندرہ برس کی تیاری کے بعد میدان میں لایا گیا۔ اس تیاری کی تفصیلات معلوم کیجیے اور دیکھیے کہ یہ کس تدریج کے ساتھ ہوئی تھی، اس میں کن صفات کی پیروی مقدم تھی۔ اور کن کی موخر، کون سی صفات کس درجہ میں مطلوب تھیں اور انھیں کس حد تک ترقی دی گئی تھی، اور کس مقام پر پہنچ کر اس جماعت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اب تم دنیا کا بہترین گروہ بن گئے ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے لیے نکلو، یہی نمونہ خود اپنی تیاری کے لیے بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں، میں صرف دو حدیثیں آپ کی رہنمائی کے لیے پیش کروں گا جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کام کے لیے کن صفات کے آدمی درکار ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطیٰ للّٰہ و منع اللّٰہ فقد استکمل الایمان (ابوداؤد، کتاب السنۃ) یعنی آدمی پورا مومن اس وقت بنتا ہے جب اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی دوستی اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ ہو خالص اللہ کے لیے ہو، نفسانی اور دنیوی محرکات اس کے لیے ختم ہو جائیں۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امرنی ربی بتسع – ’’میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم دیا ہے۔‘‘

۱- خشية الله في السر و العلانية - " کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں"
۲- و كلمة العدل في الغضب و الرضاء- " کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصہ میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں۔"
۳- والقصد في الفقر و الغنا- "خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت میں، بہرحال راستی و اعتدال پر قائم رہوں۔"
۴- وان اصل من قطعني- " اور یہ کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں۔"
۵- وان اعطي من حرمني- " اور جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں۔"
۶- واعفو من ظلمني- "اور جو مجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کروں۔"
۷- وان يكون صمتي فكراً- " اور یہ کہ میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو۔"
۸- ونطقي ذكراً- " اور میری گفتگو ذکر الٰہی کی گفتگو ہو۔"
۹- ونظري عبرةً (مشکوٰۃ، کتاب الادب)- " اور میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔"

ان اوصافِ مطلوبہ کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان امر بالمعروف و انهى عن المنكر یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔ معلوم ہوا کہ نیکی کو پھیلانے اور بدی کو ختم کرنے کے لیے جو امت وسط اٹھے اس کے فرد فرد میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔ انھیں اوصاف کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہوسکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم کبھی اپنے منصب کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔

یہ تو شخصی اصلاح کا پروگرام ہوا۔ اس سے آگے جماعتی حیثیت سے کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔ جماعتی نظم کو مستحکم اور کارگر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ارکانِ جماعت کے درمیان محبت اور ہمدردی ہو۔ آپس میں حسنِ ظن ہو، بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو، آپس میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہو، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت ہو، خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں، یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لیے ناگزیر ہیں۔ ورنہ اگر فرداً فرداً سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفاتِ حسنہ اپنے اندر پیدا کرلیں، لیکن منظّم و مربوط نہ ہوں، آپس میں متعاون نہ ہوں، شانہ سے شانہ ملا کر چل نہ سکیں، تو ہم دنیا میں علمبردارانِ باطل کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان

ہم میں ہمیشہ موجود رہے ہیں، اور آج بھی موجود ہیں۔ اور اگر آج دنیا بھر کو ہم چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہوں گے تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جاسکے گا۔ مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد تک اپنا اثر پھیلا دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا پہلوان جو بھاری بوجھ اٹھانے اور کئی کئی آدمیوں کو کشتی میں پچھاڑنے کی طاقت رکھتا ہو، ایک مضبوط رجمنٹ کے مقابلہ میں بے کار ہے۔ اسی طرح اگر ہم میں سے کچھ لوگ انفرادی تزکیہ کی تمام منازل طے کیے ہوئے ہوں، لیکن ان میں اجتماعی رابطہ اور تعاون نہ ہو تو ان کی حیثیت اسی پہلوان کی سی ہے، جو کسی رجمنٹ کا عضو بن کر کام نہیں کرتا بلکہ منفرداً ایک رجمنٹ کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے۔ انفرادی تزکیہ کے لحاظ سے ہماری اپنی جماعت میں بھی ایسے رفقاء کی کمی نہیں ہے جن کی حالت پر خود مجھے رشک آتا ہے، لیکن جہاں تک جماعتی تزکیہ کا تعلق ہے، حالات افسوس ناک ہیں۔ میں مستقبل قریب میں اس مسئلہ پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جماعتی حیثیت سے کیا کچھ ترک کر دینے کے قابل ہے اور اس کی جگہ کیا کیا چیزیں مطلوب ہیں۔

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اصول کی مفصل تشریحات موجود ہیں۔ پھر سیرتِ نبویؐ اور سیر الصحابہؓ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجیے اور ناپ تول کر دیکھیے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کیجیے۔

صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لامحالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسنِ ظن، ہمدردی، ایثار اور رواداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف، تعاون کو ایک دن بھی جاری نہیں رہنے دے گا۔ جماعتی نظم چلتا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لیے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لیے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہیے۔

تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لوازم میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قرآن وحدیث میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔ صرف تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک ایک مطلوبہ صفت

کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کس نوعیت اور کس درجہ کی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں احکام و ہدایات کو جمع کیجیے اور سمجھیے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ میں مختصراً ان کی طرف بھی اشارہ کردینا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے، صبر ہے۔ صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہوسکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دنیا کے لیے مجاہد کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے۔ مگر بہر حال صبر ہے ناگزیر۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے شدید اجتناب کیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی راہ میں جدو جہد کرتے ہوئے دشواریوں اور مزاحمتوں کے مقابلہ میں استقامت دکھائی جائے اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو تب بھی ہمت نہ ہاری جائے۔ اور پیہم سعی جاری رکھی جائے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات اور خوف اور طمع کے مواقع بھی پیش آجائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے اور یہ بھی صبر ہی کا ایک شعبہ ہے کہ اشتعالِ جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائے۔ ہمیشہ سکون، صحتِ عقل اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔ پھر حکم صرف صبر ہی کا نہیں، مصابرت کا بھی ہے۔ یعنی مخالف طاقتیں اپنے باطل مقاصد کے لیے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں اسی صبر کے ساتھ آپ بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اسی لیے "اِصْبِرُوْا" کے ساتھ "صَابِرُوْا" کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ حق کی علم برداری کے لیے اٹھنے کا داعیہ رکھتے ہیں ان کے صبر کا اپنے صبر سے موازنہ کیجیے اور سوچئے کہ آپ کے صبر کا کیا تناسب ہے۔ شاید ہم ان کے مقابلہ میں دس فیصدی کا دعویٰ کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ باطل کے غلبہ کے لیے جو صبر وہ دکھا رہے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ جنگ کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کس طرح وقت آپڑنے پر ان لوگوں نے اپنے ان کارخانوں، شہروں اور ریلوے اسٹیشنوں کو اپنے ہاتھوں سے پھونک ڈالا جن کی تیاری و تعمیر میں سالوں کی محنتیں اور بے شمار روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ یہ ان ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جو فوجوں کو اپنے آہنی پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں۔ یہ دشمن کے ان بمبار طیاروں کے سائے میں استقامت سے

کھڑے رہتے ہیں جو موت کے پر لگا کر اڑتے ہیں۔ جب تک ان کے مقابلے میں ہمارا صبر ۱۰۵ فیصدی کے تناسب پر نہ پہنچ جائے ان سے کوئی ٹکر لینے کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ جب سروسامانی کے لحاظ سے ہم ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر سروسامان کی کمی کو صبر ہی سے پورا کیا جاسکتا ہے۔

دوسری چیز جو مجاہدہ کا لازمہ ہے ایثار کی صفت ہے۔ وقت کا ایثار، محنتوں کا ایثار، اور مال کا ایثار۔ ایثار کے اعتبار سے بھی باطل کا جھنڈا اٹھانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں۔ حالانکہ بے سروسامانی کی تلافی کے لیے ہمیں ایثار میں بھی ان سے میلوں آگے ہونا چاہیے۔ مگر یہاں صورتِ واقعہ یہ ہے ایک شخص بیس، پچاس، سواور ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے عوض اپنی پوری صلاحیتیں خود اپنے دشمن کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس طرح ہماری قوم کا کارآمد جوہر بے کار ہوجاتا ہے۔ یہ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ ایک بڑی آمدنی کو چھوڑ کر یہاں محض بقدرِ ضرورت قلیل معاوضہ پر اپنی خدمات پیش کردے۔ پھر فرمائیے کہ اگر یہ لوگ اتنا ایثار بھی نہیں کریں گے اور اس راہ میں پتہ مار کر کام نہ کریں گے تو پھر اسلامی تحریک کیسے پھول سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک محض والنٹیر وں کے بل پر نہیں چل سکتی۔ جماعتی نظم میں والنٹیر وں کو اسی درجہ کی اہمیت حاصل ہے جیسے ایک آدمی کے نظام جسمانی میں ہاتھ اور پاؤں کو ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضا کس کام کے ہوسکتے ہیں اگر ان سے کام لینے کے لیے دھڑکنے والے اور سوچنے والے دماغ موجود نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں والنٹیر وں سے کام لینے کے لیے اعلیٰ درجہ کے جنرل چاہئیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جن کے پاس دل اور دماغ کی قوتیں ہیں وہ دنیوی ترقیوں کے دل دادہ ہیں اور مارکیٹ میں اسی کی طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کرسکیں۔ اس ایثار کو لے کر اگر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفسدین عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانوں کا ایثار کر رہے ہیں ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے تیسری صفت دل کی لگن ہے۔ محض دماغی طور پر ہی کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہوجانا یہ اس راہ میں اقدام کے لیے صرف

ایک ابتدائی قدم ہے لیکن اتنے سے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں اک آگ بھڑک اٹھے، زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے، یا اتنی جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جاتی ہے اور آدمی کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے، اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے، دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجیے کہ اپنی ذات کے لیے قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں۔ اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصدِ حیات کے لیے ہو، جب تک یہ دل کی لگن نہ ہوگی اور ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ تن من دھن سے اس کام میں شریک ہوں۔ میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں محض دماغی اطمینان کی بنا پر شریکِ جماعت تھا مگر اب یہ چیز دل میں اتر گئی ہے اور اس نے نہاں خانۂ روح پر قبضہ جما لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود تنقید کر کے دیکھے کہ کیا ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اس کے دل میں مقصد سے عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے۔ پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن ہوتی ہے وہاں کسی ٹھیلنے اور اکسانے والے کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورت حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک کارکن پیچھے ہٹ گیا یا نقل مکان پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوپٹ ہو گیا۔ بخلاف اس کے پھر تو ہر شخص اس طرح کام کرے گا جس طرح وہ اپنے بچے کو بیمار پا کر کیا کرتا ہے۔

خدانخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو اپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکلیہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ عذر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں کہ کوئی تیمار دار نہیں، کوئی دوا لانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں، اگر کوئی نہ ہو تو

آپ خود سب کچھ بنیں گے۔ کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ سوتیلا باپ تو بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ سکتا ہے، اس کے تو دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی نا اہلی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرجانے دیں۔ اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں۔ یہ سب باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سربلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سوتیلا رشتہ ہے، حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ ایسی بری پسپائی ہوگی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کرسکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوتِ قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجیے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔

چوتھی ضروری صفت اس راہ میں یہ ہے کہ ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور منضبط (Systematic) سے کام کرنے کی عادت ہو۔ ایک مدتِ دراز سے ہماری قوم اس طریقِ کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے، جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو، چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہوگا۔ اس کی جگہ بتدریج اور بے ہنگامہ کام کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، جو بجائے خود ضروری ہو، اگر آپ کے سپرد کر دیا جائے تو بغیر کسی نمایاں اور معجّل نتیجہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی کام میں کھپا دیں۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں رہا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے۔ ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بیں نظر میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔

تقریر کو ختم کرنے سے پہلے مختصراً میں اس امر کی تشریح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اب ہمارے سامنے پروگرام کیا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ جس پروگرام پر میں تحریک کو چلا رہا ہوں اسے سمجھا نہیں گیا۔ سب سے پہلا کام جس کے لیے یہ اجتماعات منعقد کیے جا رہے ہیں یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص سے مجھے شخصاً واقفیت ہو جائے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ میرے ساتھ کن کن اوصاف کے لوگ چل رہے ہیں، ان میں کیا کیا صلاحیتیں اور قوتیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ آپ حضرات نہایت وضاحت سے مجھے بتائیے کہ کس موقع پر آپ کیا کیا خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ جس قدر جلدی میں یہ معلومات حاصل کرلوں گا اسی قدر جلدی کام کا نقشہ تیار کرسکوں گا۔ قوت کے اندازہ کے بغیر کوئی اقدام کرنا میرے نزدیک مستحسن نہیں ہے۔ اس غرض کے لیے آپ حضرات بار بار مرکز میں آتے رہیں، خط و کتابت سے مجھے معلومات فراہم کرتے رہیں اور جہاں تک ممکن ہوگا میں خود بھی اجتماعات میں شرکت کر کے آپ سے انفرادی رابطہ کو ترقی دیتا رہوں گا اس کے بعد میں ایک مکمل نقشۂ کار مرتب کر کے تدریجاً آگے بڑھنے کی فکر کروں گا۔

دوسرا ضروری کام یہ سامنے ہے کہ ہمیں تربیتِ اشخاص کے لیے ایک ایسی مشینری بنانی ہے جس کے ذریعہ سے ہم ضرورت کے آدمی تیار کریں۔ اور اپنے کارکنوں میں ضروری اوصاف پیدا کریں۔ کل جو تجاویز پیش ہونے والی ہیں ان سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سلسلہ میں ہم بہت جلدی اقدام کرنے والے ہیں۔

تیسرا کام جس پر بہت دنوں سے بالمشافہ بھی اور خط و کتابت کے ذریعہ سے بھی مجھے بار بار توجہ دلائی جا رہی ہے اور جس کی شدید اہمیت کو میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ہے کہ نئی نسلوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تحریک کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ اب تک سرمایہ اور مناسب کارکنوں کی کمی اور جنگ کی پیدا کردہ معاشی مشکلات اس راہ کی رکاوٹ بنی رہی ہیں لیکن شاید اس سلسلے میں اب بہت زیادہ تعویق نہیں ہوگی اور عنقریب آپ سنیں گے کہ مرکز میں اس کام کی بنا ڈال دی گئی ہے۔ چنانچہ میں یہ خوش خبری بھی سنا دوں کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اسی غرض کے لیے یہاں تشریف لا رہے ہیں اور عجب نہیں کہ مستقلاً یہیں رہ جائیں۔

چوتھی چیز جس کے لیے ہمیں سر جوڑ کر سوچنا ہے، یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے ساتھ لے کر

چلنے کے لیے کیا صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اب تک ہمارا ایک ہی ہاتھ کام کرتا رہا ہے اور گاڑی کا ایک ہی پہیہ متحرک ہوا ہے، اب ہمیں اپنے دوسرے ہاتھ اور اپنی گاڑی کے دوسرے پہیے کی فکر کرنی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا اور ہماری عورتوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ ہم سے اور ہم ان سے ہر لحظ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اگر ہم ان کی اصلاح کی فکر نہ کریں گے تو خود ہماری اصلاح بھی نامکمل رہے گی۔ ہم گھروں کو مسلمان بنائے بغیر دنیا کو مسلمان نہیں بناسکیں گے۔ اس معاملہ میں ساری دقت یہ ہے کہ عورتوں سے ہم وسیع پیمانے پر براہِ راست ربط نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے لیے خود عورتوں ہی سے مدد لینی پڑے گی۔ جو قومیں کوئی شرعی ضابطہ نہیں رکھتیں ان کا معاملہ آسان ہے، وہ اپنی سیاسی اور تمدّنی تحریکات کے لیے اپنی عورتوں کو بازاروں، کارخانوں، پنڈالوں اور مدرسوں میں بے تکلفی سے لاسکتی ہیں۔ مگر ہمارے لیے یہ ایک نازک مسئلہ ہے اور اسے حل کرنے کے لیے مغز زنی کی ضرورت ہے۔

پانچواں کام یہ سامنے ہے کہ رائے عامہ کو جذب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر منظّم کوشش کی جائے۔ اب تک ہم نے رائے عام کو براہ راست مخاطب نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہم اس سمندر کے ذرا سے گوشے میں کچھ ہلچل پیدا کر سکے ہیں۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ اصل سمندر کی طرف بڑھنا ہے۔ ضروری نہیں کہ عوام پورے کے پورے ہمارے رکن بن جائیں۔ ہمارے مدعا کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ باشندگان ملک کی ایک کثیر تعداد حق کو مان لے، ہمارے مقصد کی صحت کی معترف ہو جائے اور ہمارا اخلاقی اثر اس پر قائم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر ہم جو قدم اٹھائیں گے اس میں عوام کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں گی۔ اب تک ہم نے اپنے لٹریچر میں مسائلِ زندگی کے بہت تھوڑے حصہ سے تعرض کیا ہے اور وہ بھی زیادہ تر مجمل اشارات کی صورت میں ہے۔ حالانکہ اس دور میں زندگی کے ہر پہلو پر ہمیں اپنے نقطۂ نظر سے تفصیلی روشنی ڈالنی چاہیے، علوم کی تدوینِ جدید کرنی چاہیے اور یہ کام ایک دو زبانوں میں نہیں، متعدد زبانوں میں کرنا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہمارے مدعا کو سمجھیں۔ چنانچہ اب ہمیں اس میدان میں بھی اپنی مساعی کے دائرے کو وسیع کرنا ہے۔ پھر ابھی تک ہم نے نشر و اشاعت کے لیے صرف تحریر کے ذریعہ پر انحصار کیا ہے تقریر سے ہم نے ابھی کوئی کام نہیں کیا ہے۔ اب ہمیں اس میدان کی طرف بھی بڑھنا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم تقریر کا نیا

ڈھنگ اختیار کریں، نمائشی اور ہنگامی اسٹیج سے دور رہیں اور ذمے دارانہ گفتگو کی عادت ڈالیں تاکہ جو آواز بھی ہماری طرف سے بلند ہو وہ اتنی باوقعت، وزن دار اور ممتاز ہو کہ لوگ ان کو ان بہت سے سروں میں سے ایک سر نہ سمجھیں جو ہنگامہ پرور اور بے لگام مقررین کے سازوں سے نکل رہے ہیں۔ میں نے اب تک اپنے رفقاء کو تقریر سے اسی لیے روک رکھا ہے کہ پرانی عادات کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی پرانے انداز کی تقریریں ہم بھی نہ کرنے لگیں جو نظامِ اسلامی کا نام لینے والوں کے منہ کو زیب نہیں دیتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نشرِ افکار کے تمام ذرائع کو استعمال کریں۔ مگر پہلی شرط یہ ہے کہ انھیں اخلاقِ اسلامی کا پابند بنائیں اور ان غیر صالح عناصر سے انھیں پاک کریں جو شُتر بے مہار قسم کے لوگوں نے ان میں ملا دیے ہیں۔

یہ چند ضروری باتیں تھیں جو میں آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا تھا۔ آپ ان پر غور کریں اور مفید مشوروں سے میری مدد کریں۔ اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عہد کی ذمے داریاں سمجھنے اور ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری نیتوں میں خلوص اور ہمارے ایمان کو طاقت بخشے، ہماری مساعی میں برکت دے، ہمارے تھوڑے سے عمل کو قبول کرلے اور زیادہ عمل کی ہمت دے اور اپنے ان بندوں سے ہماری تائید کرے جو ہم سے بہتر صفات رکھتے ہوں اور ہم سے زیادہ بہتر طریقہ سے دین کی خدمت کر سکتے ہوں۔

دوسری نشست

۲۷ مارچ ۹ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر

پروگرام کے مطابق دوسری نشست جماعتوں کی مقامی کارگزاری کی رپورٹیں سنانے کے لیے مخصوص تھی۔ چنانچہ مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے تفصیلاً اپنے کام اور اپنی مشکلات کو حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امیر جماعت نے کارگزاریوں کے اشتہار و اعلان کی جو ممانعت کر رکھی ہے اسے ختم کر دیا گیا، نہیں وہ بندش بدستور باقی ہے اور اسے باقی رکھتے ہوئے رپورٹیں صرف اس لیے عام مجمع میں سنوائی گئیں کہ مختلف ارکان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کہاں کہاں کس نوعیت کا کام کس طرز پر ہو رہا ہے اور اس کے مقابلہ میں کہاں کے لوگ کتنے پیچھے ہیں۔ کیا کیا مشکلات مختلف اصحاب کو پیش آ رہی ہیں اور انھیں کس طرح حل کیا جا رہا ہے۔ اس مدعا کو جناب امیر نے مختصر سی تقریر میں خوب واضح کر دیا۔ آخر میں جب جملہ مقامی جماعتوں کی رپورٹیں سنائی جا چکیں تو جناب امیر کے ایماء سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت ہی مفید ہدایات اور مشورے دیے۔ ان کی تقریر کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

تقریر جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

حاضرین! میں آپ کی رپورٹیں سننے میں ایسا منہمک رہا کہ مجھے ان رپورٹوں کے مختلف پہلوؤں پر اتنا غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا جتنا کہ ان پر تبصرہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ تاہم کچھ باتیں مجھے کھٹکتی رہی ہیں اور ان کے متعلق امیر کے حکم سے کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک آپ کی کارگزاریوں اور بیان کردہ واقعات وحالات کا تعلق ہے ان پر تبصرہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، مگر جہاں تک دوسری جماعتوں سے تعلق وتصادم کا معاملہ ہے اس میں اصلاح کی بڑی گنجائش ہے اور میں اس پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

آپ حضرات نے جن مشکلات کو پیش کیا ہے ان کا سامنا تو اس راہ میں ناگزیر ہے مگر ہم کو ان کا صحیح علاج سوچنے سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ صحیح طرز پر حق کا کام کرنے والوں کو مزاحمتوں سے تو بہر حال دوچار ہونا ہی ہے، مگر اس مرحلہ پر یہ طرزِ عمل تو قطعاً غلط ہے کہ دوسروں سے خواہ مخواہ تصادم پیدا کیا جائے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں اگر چند ضروری امور کا اہتمام کیا جائے تو ہماری راہ کے کانٹے بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز جس پر میں نے آج بھی اور پہلے بھی بہت غور وخوض کیا ہے اور جو بہت ہی مشکل معلوم ہوتی ہے، نہایت درجہ سنجیدہ توجہ چاہتی ہے، میری مراد حق کو جماعت سے باہر کے لوگوں تک پہنچانے کا مسئلہ ہے۔ دوسری جماعتوں سے ہمیں اس کے سوا کچھ مطلوب نہیں ہے کہ وہ حق کو صاف صاف پہچان جائیں۔ یاد رکھیے کہ یہ کام محض قول سے پورا نہ ہو سکے گا۔ اس کے لیے ہمیں اپنے انفرادی اعمال اور اجتماعی کردار کو وسیلہ بنانا پڑے گا۔ بجائے اس کے کہ زوردار تقریروں کا سیلاب بہایا جائے اور نظریات کی اشاعت پریس کے ذریعہ سے کی جائے ہونا یہ چاہیے کہ اپنے عمل سے ہم یہ ثابت کردیں کہ ہم اپنے مقصد میں مخلص ہیں اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور عالمِ انسانیت کے لیے بالعموم ایک حقیقی فائدے کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی سے دشمنی نہیں بلکہ دنیا کی پوری آبادی سے حقیقی ہمدردی ہے۔

آزمائش کے مختلف مواقع پر اگر ہم عمل سے یہ ثبوت بہم پہنچادیں کہ ہماری زندگی کسی خاص گروہ یا جماعت یا کسی قوم کے فائدے کے لیے نہیں ہے بلکہ حق کے نصب العین کے لیے ہے تو ذہنوں کو فتح کر لینے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ساتھ بے شمار مصیبتیں چمٹی ہوئی ہیں اور ان کا ایک اچھا خاصا موٹا خول خود ہمارے گرد لپٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ خود اپنی دعوت کی راہ کی پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ خول ہمیں جتنا جلد ممکن ہو اتار دینا چاہیے اور حق کو بالکل بے نقاب کر کے لوگوں کے سامنے لانا چاہیے تاکہ لوگ صاف صاف پہچان لیں کہ صداقت وحقیقت کیا ہے۔ اگر ہم اپنے بیوی بچوں، اپنے احباب،

اپنی جماعت اور قوم کی غلط عصبیت کی آلودگیوں سے اپنا دامن پاک کرلیں تو اگر چہ دنیا کی زبانِ طعن کبھی بند نہیں ہوسکتی مگر ہمارے خلاف حجت ودلیل کی زبان بند ہوجائے گی۔ صرف یہی طریقہ ہے دنیا کو انکارِ حقیقت سے روک دینے کا عصبیت کی بوبھی اگر باقی رہے گی تو ہم خود اپنے لیے حجاب بنے رہیں گے، اور اپنی دعوت کے راستے میں چٹان بن کر حائل رہیں گے۔ گھروں میں، بازاروں میں، جلسوں میں، خانقاہوں اور مسجدوں میں ہر پہلو سے آپ اپنے کو ادنیٰ اغراض سے بالاتر دکھانا ناگزیر ہے۔

اس گزارش کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے آپ حضرات سورۂ انبیاء کا مطالعہ کیجیے۔ اللہ کی طرف سے جتنے داعی اللہ کے کلمے کو اونچا کرنے کے لیے آئے، ان میں سے ہر ایک نے رشتہ حق کے سوا ہر رشتے کو توڑ دیا۔ حمیت جاہلیت کے سارے بندھن کاٹ ڈالے، تعصّبات کی موٹی موٹی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی دعوت بغیر کسی فرق وامتیاز کے ہر حق آشنا دل کو اپیل کرتی اور جو لوگ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ان کے سینے میں گروہوں اور جماعتوں کی برتری کے بجائے انسانیت کی خدمت کا جذبہ مشتعل ہوتا۔ اگر انھی داعیانِ ہدایت کے اسوہ کا اتباع کیا جائے تو ہماری تبلیغی مشکلات معاً حل ہوجاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر چہ جماعت کے لٹریچر میں ضروری امور بیان کیے گئے ہیں مگر کوئی مفصل پروگرام کام کا ابھی ہم نہیں بنا سکے ہیں۔ میں یہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں عرض کرسکتا کہ اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں یہ ثابت کردینے کی فکر کیجیے کہ آپ کی ساری مساعی صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہیں۔ حنفیت اور وہابیت کے جھگڑوں اور گروہوں اور جماعتوں کی بدگمانیوں کو ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہمیں کوئی نئی جماعت نہیں بنانی ہے ہمارا مقصد صرف حق کو واضح کردینا ہے۔

ایک اور چیز جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ تعلّی اور گھمنڈ جو ایک حقیقت کو پالینے یا ایک علم کو حاصل کرلینے سے آدمی میں پیدا ہوجاتا ہے، ایک داعیِ حق کے لیے سب سے بڑا حجاب ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں دوسروں سے کچھ اوپر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کی راہ میں خود روک بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ بعض لوگ اس کبر کو ذرا زیادہ صفائی سے چھپا لیتے ہیں، مگر دل میں یہ فتنہ موجود ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی گفتگوؤں اور تحریروں میں ایک بناوٹ سی آجاتی ہے اور بناوٹ دعوتِ حق کے ساتھ کوئی خفیف سا ربط نہیں

رکھتی۔ تعلّی اور تکبّر کے مظاہرہ سے لوگ بدک جاتے ہیں اور اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ آپ اس انکشاف حق کو جو آپ پر ہوا ہے اللہ کے فضل کا نتیجہ سمجھیں۔اور اس پر اس کے شکر گزار رہوں۔ یہ احساس آپ میں کبر کی جگہ تواضع کا جذبہ پیدا کرے گا۔اور بندگانِ خدا کے ساتھ آپ کے تعلق کو مضبوط کر دے گا۔ جہاں خدا کی عنایات کا احساس آدمی میں پیدا ہو جاتا ہے وہاں خود بخود تکبر کی جگہ تواضع، غضب کی جگہ ہمدردی اور بغض کی جگہ محبت کے جذبات نشو ونما پانے لگتے ہیں۔ داعیِ حق کو عوام سے ویسی ہی گہری اور قلبی محبت ہونی چاہیے جیسی ایک بچے کے لیے ماں اور باپ میں پائی جاتی ہے، اسے لوگوں کی غلطیوں سے مزا لینے کے بجائے کوفت ہوتی ہے، احتساب کی جگہ اس میں دردمندی پیدا ہوتی ہے، غرور و کبر کی جگہ اس میں ایک ہمدردانہ اضطراب رونما ہوتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لب ولہجہ میں بھی وہ سوز پیدا ہو جاتا ہے جس سے پتھر کی طرح سخت دل بھی موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔

میں نے رپورٹوں کو سن کر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء مخالف جماعتوں پر انھیں الفاظ میں چوٹیں کرتے ہیں جو مدتوں سے ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ہم اپنے مخالفین کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی طرح لذت لیتے ہیں جس طرح دوسری جماعتیں اپنے حریفوں کی تحقیر سے لذت لیتی ہیں۔ بہ کثرت ایسے لوگ بھی ہم میں موجود ہیں جو جلوت میں چاہے محتاط ہوں مگر خلوت میں وہ بھی ایک حد تک دوسروں پر طعن وطنز سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس قسم کی ریاکاری سے وہ روح کبھی بھی نشو ونما نہیں پا سکتی جس کا نام خلوص ہے اور خلوص کے بغیر دعوتِ حق کو دوسروں کے دل ودماغ میں اتارنا ناممکن ہے۔

اصل میں جب ہم سوچتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے جانا ہے وہ دوسروں کو نہیں معلوم ہے اور پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ آخر اتنی بدیہی بات دوسرے کیوں نہیں سمجھتے تو ہمارے اندر کچھ قائدانہ اور کچھ معلّمانہ شان پیدا ہو جاتی ہے اور ہم دوسروں کو اسی طرح ملامت اور سزا کا مستحق خیال کرنے لگتے ہیں۔ جس طرح ایک معلم اپنے شاگرد کو اس کی ہر غلطی پر گوش مالی کا مستحق سمجھتا ہے، لیکن تعلیم پر غور کرنے والے اصحاب سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ یہ طریقۂ تعلیم سرے سے غلط ہے۔ اگر تعلیم کو دلوں میں اُتارنا مقصود ہے تو غضب، طنز اور تعریض، درشت زبانی اور تلخ گفتاری کے ہتھیار کھول ڈالیے۔ آپ کسی سے لڑنے نہیں جا رہے ہیں۔ تعلیم وتبلیغ کی مہم درپیش ہے اور اس مہم کے لیے

دل سوزی، ہمدردی اور احساسِ اخوت کے اسلحہ ہی مفید ہوسکتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپؐ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا گزرا ہے؟ ارشاد ہوا، طائف کا دن۔ اس دن دنیا کا سب سے بڑا انسان پتھروں کی باڑھ کا نشانہ بنتا ہوا ایک باغ کی ٹٹی کی پناہ لیتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ ان ظالموں کے حق میں بد دعا کیجیے تو وہ بد دعا کرنے کے بجائے اہل طائف کے لیے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ یہ اسپرٹ پیدا کیے بغیر اور کام تو شاید ہوسکتے ہیں لیکن حق کا کام نہیں ہوسکتا۔ لوگ اگر حق کے مزے سے واقف نہیں ہیں تو صداقت کی خوشبو سے محروم ہیں تو وہ غضب کے نہیں، ہمدردی کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ ہم بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ حق کو پہچاننے کی سعادت سے محروم ہیں۔ مگر اس پر یہ کیسے جائز ہوگیا کہ ان سے بے رحمی اور غرور کا برتاؤ کیا جائے۔ ہماری کوشش دوران تبلیغ میں یہ ہونی چاہیے کہ لوگ یہ محسوس نہ کریں کہ انھیں گھسیٹ کر یا ہانک کر کسی طرف بلایا جارہا ہے، بلکہ یہ سمجھیں کہ وہ خود بخود ایک حقیقت تک پہنچے ہیں۔ اصولی مسلمات پر تمام مسلم جماعتیں متفق ہیں اور اگر نرمی، حلم اور برادرانہ محبت سے کام لیا جائے تو آسانی سے ان تمام جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ کام مناظرہ بازی اور دماغی فتح کی خواہش کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ یہی خواہش تو انسان کو تعصب اور تشدد پر آمادہ کرتی ہے۔

آپ حضرات اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں جونہی اس خواہش کا اثر محسوس کریں، وہیں اپنے نفس کی باگ کھینچ لیں۔ اور اگر مخاطب کی طرف سے اس کا مظاہرہ ہو تو "قَالُوْا سَلَامًا" کا طریقہ اختیار کریں۔ تبادلۂ خیالات کے دوران میں ہار جیت کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ داعی کا مقام ایسی چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اسے تو صرف کلمۂ حق کے چند بیج ذہنوں میں ڈالنے ہیں اور پھر دماغی کھیتوں کی رکھوالی کرنی ہے۔ کبھی یہ خیال بھی دل میں نہ آنے دیجیے کہ ہماری بات رہ جائے۔ یہی خیال اصطلاحی مناظرہ کی روح ہے۔ اسی کی مشق ہم سالہا سال سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اب آپ کو پوری قوت کے ساتھ اس عادت کی جڑیں اکھاڑنی ہیں۔ اب ہمیں مناظروں میں جیتنے کے بجائے ہارنے اور بار بار ہارنے کی مشق بہم پہنچانی ہیں۔ جہاں گفتگو سے خلوص کی روح رخصت ہونے لگے وہیں زبان پر قفل چڑھا لیجیے اور کچھ پروانہ کیجیے کہ اس پر تالی پٹ جائے گی۔ زبان کی ہر لغزش پر بے تکلفی سے مخاطب سے معافی

طلب کیجیے اور اس سے بے نیاز ہو جایئے کہ آپ پر آوازے کسے جائیں گے۔ ان شکستوں کو اگر سہنے کی ہمت ہو تو آگے آیئے اور کام کیجیے ورنہ اگر مناظرانہ ہتھکنڈوں سے کسی کو آپ کھینچ کر لائے بھی تو وہ جس راستہ سے آیا ہے اسی راستہ سے ایک دن واپس بھی ہو جائے گا۔

اگر اس معاملہ میں آپ انبیاء کے طریق کار پر غور وخوض کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی چند خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی موجودہ جماعتوں میں سے ہماری جماعت نبیوں کے طریق کار کی پیروی کا عزم لے کر اٹھی ہے۔ پس ہمیں براہ راست وہیں سے روشنی حاصل کرنی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جب کبھی کوئی نبی آیا تو اس نے اپنی قوم کو یوں مخاطب نہیں کیا کہ ’’اے کافرو! ایمان لاؤ‘‘۔ ’’اے گمراہو! سیدھی راہ پر آجاؤ‘‘ بلکہ محبت آمیز انداز میں ’’یا قوم، یا ایہا الناس اور یا اہل الکتاب‘‘ کے الفاظ سے انھیں مخاطب کیا۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ ان کے ساتھ ہوئے انھوں نے جب ایمانی کمزوریاں دکھائیں اور تنبیہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انھیں بھی یوں نہیں مخاطب کیا کہ ’’اے منافقو! یا اے بدعہدو! اپنی روش کو بدلو۔‘‘ بلکہ انھیں ’’یَآ اَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ کہہ کر پکارا۔ پھر جو لوگ ان دعاۃ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تو انھوں نے بھی اپنے طرز خطاب کو حلم، محبت اور نرمی کی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

پھر آگے چل کر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ ایک صالح و مصلح جماعت اپنے قول وعمل سے حق کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے اور حق کا چہرہ گرد وغبار سے صاف ہو کر لوگوں کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس موقع پر حق کو کھلم کھلا دیکھنے کے باوجود لوگ مکابرت، ضد یا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دلائل کا ترکش خالی ہو جانے کے بعد بھی انکار کی روش جاری رہتی ہے تو پھر نبی کا طرزِ خطاب بدل جاتا ہے۔ پھر وہ سرکشوں کو صاف الفاظ میں ’’یَآ اَیُّھَاالْکٰفِرُوْنَ‘‘ کہہ کر پکارتا ہے اور اپنی قوم سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے مدتِ مدید تک وہ ملاطفت سے ہی دعوت دیتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اپنی قوم کے ساتھ یہ روش اس وقت اختیار کی جب دعوت واضح ہو چکی تھی۔ اور قوم کی اندھی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انھوں نے خود اپنے کفر کا اعلان کر دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ معترضین اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ درحقیقت جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت کمزور تھی تب حلم وعفو تھا مگر جب طاقت آنے لگی تو درشتی پیدا ہونے لگی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی انسانوں کی کمزوریوں کا صحیح صحیح اندازہ کرتا ہے اور

انھیں کمزوریوں کے پیش نظر وہ ان سے شفقت کا سلوک روا رکھتا ہے۔ اس کی یہ شفقت اتنی فیاضانہ ہوتی ہے کہ شریر لوگ اس کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نبی یہ سب کچھ دیکھتا ہے مگر کسی کو پیچھے نہیں پھینکتا۔ وہ صرف عمومی انداز میں جماعت اور جماعت سے باہر کی لوگوں پر تنقید کرتا ہے، "مابال قوم یفعلون کذاو کذا" (لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے) ان تنبیہات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ عدم تفقّہِ دین کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں وہ سنبھل جاتے ہیں۔ آخر میں جا کر صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو سو فیصدی ہٹ دھرم ہونے کی وجہ سے جماعت کے نظم کو درہم برہم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ جب ان کی طرف سے اصلاح کی ہر توقع ختم ہوجاتی ہے تو پھر نبی اپنی محنتوں کے قیمتی ثمرے یعنی اپنی جماعتِ صالحہ کو خطرے سے بچانے کے لیے "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" کے طریقہ پر مامور کیا جاتا ہے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ دورِ فتن ہے۔ اس کو اپنی جن علمی روشنیوں پر ناز ہے وہ صرف دنیا کو تاریک کرنے میں معین ہوسکی ہیں۔ بلکہ انصاف یہ ہے کہ باطل کو حق اور حق کو باطل بنا کر دکھانے کی سعی کے لحاظ سے تاریخ کا کوئی دور اس دور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پھر جب کہ حق واضح اور آشکارا نہیں ہے تو دوسروں پر سخت گیری کرنے کی گنجائش کہاں ہے؟ یہ وقت "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" پر عمل کرنے کا نہیں ہے۔ ابھی تو ایک لمبا دورِ محبت و شفقت ہمیں طے کرنا ہے اور اس دور میں کسی کو پیچھے نہیں پھینکنا ہے۔ البتہ اگر خدا ہماری محدود مساعی کو قبول فرما کر ہمیں احقاقِ حق اور ابطال کے لیے کوئی نظم قائم کرنے کی توفیق دیدے اور "قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کی صبح سعادت طلوع ہوجائے تو پھر یہ روشنی کھوٹے اور کھرے، اعمیٰ اور بصیر، مومن اور منافق کو ایک دوسرے سے خود ممیّز کردے گی۔

پچھلے عرصہ میں ہمارے رفقاء نے جہاں کہیں انبیاء کے طریقِ دعوت کو چھوڑ کر جلد بازی سے کام لیا ہے وہاں یہ غلط فہمی پھیل گئی ہے کہ ہم خدانخواستہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے، یہ غلط فہمی نظر انداز کردینے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ہماری دعوت کی طرف سے کان بند کرلیں گے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ صحیح شعورِ دینی سے محروم ہوچکا ہے اور موجودہ نظام طاغوت نے ان کی اس جہالت کے بڑھانے میں پورا حصہ لیا ہے۔ یگانوں اور بیگانوں نے مل کر ان کو ایسے انجکشن دیے ہیں کہ ان کی

قوتِ شامّہ ماؤف ہوگئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی قوتِ شامّہ کو بیدار کریں۔ جب ان کی قوتِ شامّہ بیدار ہو جائے گی تو وہ خود اپنی موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگیں گے اور کفر وشرک اور نفاق کی ساری غلاظتوں سے انھیں از خود نفرت ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لیے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو باتیں کفر وشرک ہیں ہم ان کا کفر وشرک ہونا واضح کر دیں، بس اس قدر کافی ہے۔ کسی مسلمان کی روح، شرک کو محسوس کر لینے کے بعد اس سے دوستی نہیں رکھ سکتی۔ جس شخص میں صفائی اور طہارت کا مذاق پیدا ہو جاتا ہے وہ خود اپنے دامن کی نجاستوں کو دھونے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم نے مسلمانوں میں صحیح شعور دینی بیدار کر دیا تو وہ از خود ساری آلودگیوں سے پاک ہونے کی کوشش کریں گے۔

اس دینی شعور کو عام کرنے کی جدوجہد میں یہ لازم ہے کہ ہماری توجہ دین کے عام اصول پر مرکوز رہے۔ جزوی مسائل میں نہ الجھے، دین کی اساس توحید، رسالت اور معاد کے صحیح تصورات اور معتقدات پر قائم ہے۔ یہ معتقدات اگر ذہنوں میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ واضح ہو جائیں تو دین کا صحیح شعور پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کی وجہ سے جزوی امور میں خود بخود اصلاح ہوتی چلی جائے گی اور ہمیں ان کے لیے کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنی پڑے گی۔ جب کسی شخص میں مذاقِ سلیم پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی جائے قیام، لباس اور بدن کی ایک ایک گندگی پر توجہ دلانے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ میں خود ہی نفاست اور ستھرائی نمودار ہونے لگتی ہے۔

اب میں آپ کے اس سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو آپ نے کیا ہے کہ کیا جزئیات سے میری مراد 'آمین بالجہر' وغیرہ کی قسم کے مسائل ہیں؟ نہیں، یہاں جزئیات سے میری مراد آمین بالجہر اور رفعِ یدین وغیرہ کی قسم کے مسائل نہیں ہیں۔ ان مسائل اجتہادیہ میں تو ہمیشہ ہمیں رواداری ہی کا مسلک اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ان کے دونوں پہلوؤں کے لیے دین میں گنجائش ہے۔ میں یہاں جزئیاتِ امور سے غضِ بصر کا مشورہ دے رہا ہوں جن کے لیے دین میں کوئی گنجائش نہیں، لیکن خدمتِ دین کی مصلحت مقتضی ہے کہ اپنی دعوت کے اس مرحلہ میں ہم ان سے بھی چشم پوشی کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم شاخوں کے تراشنے میں اپنا سارا وقت برباد کر دیں گے اور فتنوں کی جڑوں کی طرف توجہ کرنے کی نوبت

ہی نہ آئے گی۔ ہمارا کام صحیح طور پر جب ہی ہوسکتا ہے کہ توحید اور رسالت اور معاد کے پورے پورے متعلقات اچھی طرح عوام کو سمجھا دیے جائیں یہ لمبا راستہ طے کر لینے کے بعد لوگ جزوی امور میں راہِ حق کو پا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ خود محسوس کرنے لگیں گے کہ فلاں کام جو ہم کرتے ہیں وہ ہمارے عقیدۂ توحید کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ فلاں رسم جو رائج ہے ہمارے تصور رسالت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی اور فلاں عادت جو فروغ پائے ہوئے ہے ہمارے تصور معاد کے ساتھ مطابق نہیں ہے۔ بہر حال ان جزئی امور میں کسی گروہ کو سخت وسست کہنا یا کسی سے مقاطعہ کرنا ہمارے کام کے لیے قطعاً مضر ہے۔ حتی الوسع ان معاملات میں چشم پوشی کیجیے۔ اگر کوئی سلیم الفطرت آدمی اس سلسلہ میں کچھ سننا گوارہ کرے تو نرمی سے کہیے کہ بھائی یہ کیا چیزیں ہیں جو تم نے اختیار کر رکھی ہیں۔ پھر اگر وہ کچھ اثر لے تو بہتر ورنہ خاموش ہو جائیے۔ پرزور اصلاح ان چیزوں کی ہونی چاہیے جن سے اصل دین پر زد پڑتی ہے۔

اصلاح کے کام میں ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ پہلے کسی اصل کے قریب ترین مقتضیات پیش کیے جائیں، پھر اس سے بعید، پھر اس سے بعید تر، مثلاً توحید کے مقتضیات میں سے سب سے پہلے وہ چیزیں لینی چاہئیں جن پر عموماً سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ پھر آگے چل کر ان خفی امور کی وضاحت کیجیے جو اوّلیات توحید سے مستنبط ہوتی ہیں۔ پھر اور آگے چلیے اور ان آخری مقتضیاتِ توحید کی طرف رہبری کیجیے جن سے عوام کی توجہ تو بالکل ہی ہٹ چکی ہے اور علماء بھی کسی نہ کسی حد تک ان کے عملی مقتضیات سے غافل ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے رفقاء اِن مشوروں پر عمل کرنے کا اہتمام کریں گے۔

تیسری نشست

۲۷ مارچ (نمازِ ظہر و نمازِ عصر کا درمیانی وقفہ)

یہ نشست صرف تجاویز کے لیے مختص تھی۔ چنانچہ بہت سے اصحاب نے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز کو اور ان پر ہونے والی بحث و تمحیص کو مختصراً یہاں اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ جماعت کے اراکین اور ہمدرد اور اس کے کام کو تنقیدی نظر سے دیکھنے والے اصحاب یہ اندازہ کر سکیں کہ ہمارے حلقہ کے دماغ کس طرز پر سوچ رہے ہیں اور ذہنی طور پر کس پہلو سے کیا کمی ہے۔ اب یہاں اصل ترتیب کے مطابق ایک ایک تجویز کو پیش کیا جاتا ہے:

تجویز ۱- مجوزہ نصر اللہ خاں صاحب عزیز، مدیر اخبار 'مسلمان'، منجانب جماعت لاہور

اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ایک نگراں تنظیم یعنی قیم جماعت کا تقرر عمل میں لایا جائے جو دَورہ کر کے مختلف مقامی جماعتوں کو سرگرم عمل رکھے۔

اس پر صاحبِ امر کی طرف سے کہا گیا کہ تجویز کی اہمیت تو بالکل ظاہر ہے البتہ مطلوبہ آدمی کا ہاتھ آنا اور اس کے اخراجات کا بار اٹھانے کی ہمت کرنا، یہ ہیں دو مشکلات۔ اس کا حل یوں ہوسکتا ہے کہ جماعت بیت المال کو مضبوط بنانے کی فکر کرے اور ادھر میں سوچ کر کسی آدمی کو آزمائشی طور پر قیم جماعت کے منصب کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ چنانچہ اس پر جماعت متفق ہوگئی۔

تجویز ۲- مجوزہ ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز، لاہور

اس تجویز میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جماعت، مرکز میں اہلِ دماغ و اہل قلم حضرات کو جمع

کرے اور انھیں ریسرچ کے کام پر لگا دے تا کہ وہ اطمینان سے جماعت کے نظریات کی اساس پر مختلف علوم کی تدوین کرتے رہیں۔ ملک صاحب نے ان حضرات کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رائلٹی کا طریقہ بھی پیش کردیا۔ اس پر کچھ گفتگو ہوئی اور آخر امیر جماعت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کام کے لیے نہ صرف یہ کہ بسر اوقات کے لیے مناسب وظیفے کارکنوں کو دینے پڑیں گے بلکہ ان کے رہنے سہنے کے لیے مرکز میں کافی عمارتیں ہونی چاہئیں۔ علاوہ بریں وسیع پیمانے پر ایک کتب خانہ مہیا کرنا ہوگا۔ یہ ساری ضروریات جنگ کے زمانے میں مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ ویسے میں خود اس قسم کے کام کو شروع کردینے کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہوں اور شاید جنگ کے خاتمہ پر ایک سال کے اندر اندر شعبۂ علمی کے ماتحت ایک تحقیقی و تصنیفی مرکز کی بنیاد رکھ دی جائے۔ مگر اس چیز کا خیال رکھیے کہ تجارتی اصولوں پر یہ کام نہیں ہوگا۔ ورنہ کارکنوں میں کاروباری ذہنیت پیدا ہوجائے گی۔ دماغی اور علمی کام تو صرف خدمت کے اصول پر ہونے چاہئیں۔ بیت المال ایسے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی تصور مزد کے بغیر مناسب وظائف دیتا رہے گا۔

تجویز ۳- مجوزہ جناب غازی سلطان محمود صاحب آف مردواں (ضلع شاہ پور)۔ بشمول تجویز جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز منجانب جماعت لاہور

ہر دو حضرات کی تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکز موجودہ مقام سے منتقل کرکے کسی مرکزی مقام پر لایا جائے۔

اس پر امیر جماعت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ جب تک کسی مقام پر ضرورت کے مطابق زمین اور زمین کو استعمال کرنے کے لیے ناگزیر وسائل فراہم نہ ہوجائیں، انتقالِ مرکز کی کوئی تجویز وزن نہیں حاصل کرسکتی۔ اس پر مختلف مقامات کے بعض اصحاب نے زمین یا دوسرے وسائل کی پیش کش کی۔ ان حضرات کو یہ کہا گیا کہ آپ جو کچھ جماعت کو دے سکتے ہیں، دیں۔ جہاں بھی زمین اور وسائل فراہم ہوجائیں گے انھیں استعمال کرنے میں ہم دریغ نہ کریں گے۔

تجویز ۴- مجوزہ جناب حافظ فتح محمد صاحب راہوں (جالندھر) بشمول تجویز جناب قاضی حمید اللہ صاحب (سیالکوٹ)

حافظ صاحب کی تجویز کا مدعا یہ تھا کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے مرکز میں جلدی ایک تربیت گاہ قائم ہو جانی چاہیے اور قاضی صاحب نے عام ارکانِ جماعت اور مبلغین کی ضروری تربیت کے لیے مناسب انتظام کا مطالبہ کیا۔

اس تجویز کے جواب میں امیر جماعت نے وضاحت سے بتایا کہ یہ دونوں کام ہمارے پیش نظر ہیں۔ اسباب کی کمی کی وجہ سے اب تک دونوں اسکیمیں معرضِ التوا میں رہیں، مگر اب مجبوراً توکلاً علی اللہ قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ میں مولانا امین احسن صاحب اور بعض دوسرے رفقاء کے مشورے سے نقشۂ کار مرتب کرکے اس سلسلہ میں بہت جلدی کام شروع کردینے والا ہوں۔

تجویز ۵- مجوزہ جناب محمد شریف صاحب (نوشہرہ)

اس تجویز کا مفاد یہ تھا کہ جماعت کے ان اہلِ ہنر اراکین کو جو سرمایہ نہیں رکھتے، جماعت کے سرمایہ سے کاروبار پر لگایا جائے۔ ان لوگوں کی پوری کمائی بیت المال میں چلی جایا کرے اور انھیں صرف بقدرِ ضرورت معقول معاوضہ ملتا رہے۔ اس سے مجوّز کو بیت المال کی تقویت مقصود تھی۔

اس پر کافی دیر مشاورت ہوتی رہی۔ اور آخر میں امیر جماعت اس نتیجہ پر پہنچے کہ کاروبار کے اصولوں پر بطور جماعت کوئی اسکیم عمل میں نہ لائی جانی چاہیے۔ البتہ افراد آپس میں بطور خود اس طرز پر کام کریں تو اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ اس پر مجوز نے تجویز واپس لے لی۔

دوران مشاورت میں چونکہ بیت المال کی تقویت کا مسئلہ زیر بحث آگیا تھا اس لیے ایک تجویز حافظ عطاء الرحمٰن صاحب نے یہ پیش کی کہ جماعت کے جملہ ارکان کو اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ بیت المال کو ادا کرنا چاہیے۔

اس پر امیر جماعت نے یہ فیصلہ دیا کہ ضابطہ بندی کے ذریعہ سے ارکان کو انفاق پر آمادہ کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ ہاں جس رکن کو بطور خود اپنے فرض کا احساس ہو وہ اپنے اوپر خود پابندی عائد کرے۔

اس کے بعد نعیم صدیقی صاحب نے ایک اور تجویز پیش کی جس کا مدعا یہ تھا کہ چونکہ ظالمانہ نظام معیشت نے حلال ذرائع آمدنی تک کو ناپاک بنا ڈالا ہے اور ہم میں سے کسی کی آمدنی بھی پاک نہیں رہ گئی ہے لہٰذا ہمارے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اضطرار کی رخصت سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے ہم صرف ضروریاتِ زندگی کی حد تک اپنی آمدنیوں کو استعمال کریں اور بقیہ کو بیت المال کے حوالہ کر دینے کا التزام کریں۔ اس غرض کے لیے جماعت اخراجات کی مناسب تحدید کر دے۔

اس پر جناب امیر نے جواباً کہا کہ تحدیدِ اخراجات جس قانونیت کو مستلزم ہے اسے ہم اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مجوز نے یہ ترمیم کر دی کہ اگر قانوناً نہیں تو کم از کم اخلاقاً ہمیں اس کا پابند ہو جانا چاہیے۔ تجویز کی اس شکل سے جناب امیر نے اتفاق کر لیا۔ مگر دوسرے رفقاء کے اعتراض کا سلسلہ چونکہ تھمنے میں نہیں آرہا تھا، اس لیے مجوز نے برضا و رغبت اپنی تجویز واپس لے لی۔

تجویز ۶ - مجوزہ حافظ عطاء الرحمٰن صاحب (دارالسلام)

حافظ صاحب نے اس ضرورت کو واضح کیا کہ عہد حاضر کا انسان ایک نئے معاشی نظام کا طلب گار ہے اور جماعت اسلامی کو ایک مجلسِ تحقیق معاشیات مقرر کرنی چاہیے جو ایک طرف اسلامی اصول معیشت کو جمع کرے اور دوسری طرف موجودہ دور کے علم المعیشت کا مطالعہ کرے، حتیٰ کہ ایک نیا علم المعیشت مدوّن ہو جائے۔ یہ مجلس اپنے اخرجات کو سہ ماہی یا ششماہی رپورٹوں کی اشاعت سے پورا کر سکتی ہے۔

اس تجویز کی اہمیت کو امیر جماعت نے محسوس کیا مگر اس کام کو تجویز ۲ کے مطلوبات میں شمار کیا یعنی جہاں ہمارا مجوزہ ادارۂ تحقیقات علمیہ دوسرے مختلف علوم کی تدوین کرتا رہے گا وہاں معاشیات کے میدان میں بھی تحقیق و تدوین جاری رہے گی۔

تجویز ۷ - مجوزہ محمد یحییٰ صاحب (دارالسلام)

یہ تجویز جماعت کو ایک خاص پہلو سے معاشی تبدیلیوں پر آمادہ کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ جماعت مساواتِ آقا و غلام کے اصول پر ملازمین اور مزدوروں کے حقوق متعین کرے اور ان کی ادائیگی میں اراکین خاص مستعدی کا مظاہرہ کریں۔

اس تجویز پر جناب مولانا امین احسن صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگرچہ اصولاً یہ مطالبہ برحق ہے، لیکن اگر تجویز کے مطابق مسئلہ پیش نظر کے چند محدود پہلو لیے جائیں تو ہم پر ہی اعتراض وارد ہوگا کہ ان کے پاس کوئی جامع نظام نہیں ہے حالانکہ اسلام نے اس معاملہ میں بہت تفصیل سے احکام دیے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان احکام کو تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے عام کیا جائے۔ اس کے بغیر اگر جزئیاتی تغیر ہو تو نا کافی ہوگا۔

اس کے بعد جناب امیر نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے بہت سی تجویزوں کے دوران میں یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ بنیادیں اٹھانے سے پہلے کھڑکیاں اور روشن دان بنالینا چاہتے ہیں اگرچہ یہ سب چیزیں بجائے خود ضروری ہیں، مگر اپنے مقام پر اقدارِ دینی کو الٹ پلٹ دینا مفید نہیں ہوگا۔ جو معاشی اصلاح ہمیں مطلوب ہے وہ ضابطہ بندی سے نہیں ہوگی بلکہ ایمان اور اخلاق کے استحکام سے ہوگی۔ ہمیں ایک بچے کی طرح فطری ارتقا کرنا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ قبل از وقت مصنوعی طور پر بالغ بننے کے لیے بازار سے داڑھی خرید کر لگائیں، چاہے ماحول کا دباؤ اور مطالبہ کسی پہلو سے کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے وقت سے پہلے کوئی اقدام مناسب نہیں ہوگا۔

اس بحث کے دوران میں امارت کی طرف سے بھی یہ وضاحت کردی گئی تھی کہ تحکّم سے کسی تجویز کو رد نہیں کیا جائے گا بلکہ دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تجویز ۸- مجوزہ جناب محمد فاضل صاحب (امرتسر)

مجوز موصوف نے اساسی تعلیم کے لیے نصاب کی تدوین کی ضرورت کو پیش کیا اور جناب امیر نے اس پر مختصراً یوں اظہار خیال کیا کہ میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ کچا کام کرنے پر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ نصاب کا تقاضا بہت پرزور ہے مگر جامع اور اطمینان بخش کام کے لیے حالات کا منتظر ہوں۔ جماعتی حیثیت سے تو ہم وہی چیز پیش کریں گے جو جامع اور مکمل ہو۔ اس سے پہلے آپ لوگ اپنے اپنے مدارس کا کام چلانے کے لیے غیر رسمی طور پر جماعت کے ان اصحاب سے مشورہ لیں جو تعلیم کے کاموں سے نظری یا عملی تعلق رکھتے ہیں۔

تجویز ۹- مجوزہ جناب محمد فاضل صاحب (امرتسر)

اس تجویز کا اقتضاء یہ تھا کہ ہمارے اصحاب عربی بول چال کی عادت ڈالیں تاکہ قرآن وحدیث سمجھنے میں آسانی ہو اور اسلامی تمدن فروغ پانے لگے۔

اس پر جناب چودھری محمد اکبر صاحب ہیڈ ماسٹر (لائل پور) نے یہ کہا کہ اب تک عربی پڑھنے والوں اور نہ پڑھنے والوں میں عملاً کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ خود عراق اور مصر وعرب کے لوگ عربی بولتے ہیں مگر وہ بھی مغربیت سے متاثر ہیں۔ ایسے غیر فطری طریقے ہمارے مقصد کے لیے کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔

اس کے بعد مولانا امین احسن صاحب نے یہ فرمایا کہ جہاں تک قرآن وحدیث کو سمجھنے سمجھانے کا تعلق ہے ہم ایک خاص گروہ کو اتنا تیار کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ محققانہ نظر سے دین کو سمجھے اور سمجھائے۔ اس غرض کے لیے عربی بول لینے سے کام نہیں چلتا۔ رہے عوام تو انھیں ہم خود انھیں کی زبانوں میں اسلام کی سادہ تعلیم دیں گے۔

جناب امیر نے اس سلسلہ میں اپنی رائے دیتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے اور جو حضرات عربی مدارس میں عربی بولتے اور پڑھتے ہیں وہ بھی اس عربی سے ناواقف ہیں جو قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے لابدی ہے۔ ہم اس عربی سے رفقاء کو واقف کرانا چاہتے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں عربی بول چال کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگوں کی اور اپنی مادری زبانوں کو ختم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔

تجویز ۱۰- مجوز جناب امیر (دارالسلام)

امارت کی طرف سے جماعت کا لٹریچر شائع کرنے کے لیے یونائیٹڈ پبلشرز (لاہور) اور جناب مولوی ثناء اللہ خاں صاحب (لاہور) کی طرف سے آئی ہوئی دو پیش کشوں (Offers) کو حاضرین کے سامنے رکھ کر مشورہ طلب کیا گیا کہ کس پیش کش کو قبول کیا جائے؟

یونائیٹڈ پبلشرز دائمی حقوقِ اشاعت لینا چاہتے تھے مگر مولوی ثناء اللہ صاحب بالمعاوضہ کاغذ فراہم کر دینے کی حد تک معاملہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس پر بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ مولوی ثناء اللہ خاں صاحب کی پیشکش کو قبول کر لیا جائے۔

تجویز ۱۱- مجوزہ جناب حکیم محمد حسین صاحب (کپورتھلہ)

مجوز کا مطالبہ یہ تھا کہ امیر جماعت کی پوری اطاعت کو دستوراً لازم کر دیا جائے مگر اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ دستور کی ترمیم پوری جماعت کے اجتماع میں اتفاقِ رائے سے ہو سکتی ہے لہٰذا اس محدود اجتماع میں اسے پیش نہیں ہونا چاہیے چنانچہ حکیم صاحب نے تجویز واپس لے لی۔ اس کے بعد کچھ سوالات کے زبانی جوابات دیے گئے۔

چوتھی نشست

۲۷ مارچ (نماز مغرب وعشاء کا درمیانی وقفہ)

یہ نشست جناب امیر کی طرف سے ہدایات دینے کے لیے پروگرام میں مخصوص کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ ہدایات ایک مربوط تقریر کی شکل میں دی گئیں جنھیں یہاں درج کیا جاتا ہے:

امیرِ جماعت کی اختتامی تقریر

جو روداد یں صبح کی نشست میں جماعتوں کی طرف سے پیش ہوئی ہیں ان پر میرے محترم رفیق مولانا امین احسن صاحب نے جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے بعد مزید تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مجھے بعض امور کے متعلق صرف چند مشورے پیش کرنے ہیں۔

سب سے پہلے تبلیغی پالیسی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ ہماری دعوت کا اصول "الا قدم فالا قدم" ہونا چاہیے۔ جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی پہلے تعرض ہونا چاہیے اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیے۔ اسی طرح جس چیز کی دینی اہمیت کم ہے اس پر بعد میں توجہ دینی چاہیے۔ اور اس کی قدر و قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جدا جدا زور دینے کے بجائے اس اصل الاصول کی فکر کرنی چاہیے جس کی اصلاح سے فروع کی اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل جل کر گر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روکنے کے لیے الگ الگ تدابیر نہیں اختیار کی جائیں گی بلکہ براہ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی

فکر کی جائے گی۔ یا مثلاً اگر کسی شخص کا خون خراب ہو اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو رہے ہوں، تو ایک ایک پھوڑے پر نشتر چلانے اور ایک ایک ناسور پر پھاہا رکھنے کی جگہ اصلاحِ خون کی تدبیر کی جائے گی۔ اسی اصول پر ہمارے مبلغین کو مقامی حالات پر غور کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہماری جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا؟ اور پھر ہر ضرب اسی اصل علت کو دور کرنے کے لیے لگائی جانی چاہیے۔ اس کام کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے۔ اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور پھر اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیے۔ یہ جڑ اگر قائم ہو گئی تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے۔

جماعت کا پورا لٹریچر اسی اصول پر لکھا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی امور کے استحکام کے لیے پورا زور استدلال صرف کیا گیا ہے مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاخوں کی کٹائی چھنٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قصرِ حیات کے مٹتے ہوئے نقوشِ زینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں بلکہ اس کی بنیادوں کی فکر کریں، ورنہ دیواروں کی خوب صورتی تو ترقی کر جائے گی مگر اس کی تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت کو کھنڈر بنتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آتا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے اور پھر ہر نشترِ اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ آپ لوگ اب اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیے۔ بار بار کے تجربے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جزئیات پر حملہ کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی وادیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس طرز پر کام کرنے سے خواہ مخواہ جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے چبھنے والے القاب مثلاً وہابی اور بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ سر پھٹول تک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریق تبلیغ کو دہرانے سے قطعاً اجتناب کیجیے۔

جیسا کہ مولانا امین احسن صاحب نے اپنی تقریر میں واضح کیا ہے۔ اگر آپ حضرات غور کریں تو معلوم ہو گا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے، یا عقیدۂ معاد کی ناواقفیت سے۔ علاوہ بریں کچھ خرابیاں ایسی

ہیں جو اصول وفروعِ دین کی صحیح ترتیب کو الٹ دینے سے نمودار ہوئی ہیں۔ خود بگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں اور وہ ہے کتاب وسنت سے بے تعلقی۔ یہ سبب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ بکثرت علماء تک کتاب وسنت سے براہ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے۔ اب ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہیے۔ جب تک بنیادی معتقدات کی اصلاح نہیں ہو جاتی لوگوں کی فروعی گمراہیوں کو صبر سے گوارا کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فروعات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ زور ہرگز نہ دیا جائے۔

یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو شرارت اور خبث کی بنا پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام بے چارے محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ مدت ہائے دراز کی غلط تعلیم وتربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اتر گئی ہے کہ جن طور طریقوں کو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں انھیں کا نام دین ہے۔ ان بے چاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صبر وتحمل سے بتدریج توحید، نبوت اور معاد کے اسلامی تصورات کو ان کے دلوں میں راسخ کیا جائے ان کے عقائد کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف ''وہابی، وہابی'' پکار کر بھیڑ جمع نہ کر سکے گا۔ بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلابِ عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوے کی صداقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے روگردانی کرنے والوں میں بالکل مختصر سا گروہ ایسا تھا جو ذاتی اغراض کی بنا پر مخالفت کر رہا تھا، باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے۔ پھر جب تحریک پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آ گیا تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لیے انکار کے راستے مسدود ہو گئے، ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اغراض کی بنا پر لڑ رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ میدان میں ہم تنہا رہ گئے ہیں اس لیے وہ سر جھکا دینے پر مجبور ہو گئے، آج بھی دعوت حق کی کامیابی کا یہی راستہ ہے۔ اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عریاں کر دیں تو ان میں سے نیک نیت فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے اپنے کبراء کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملیں گے۔ پھر جو لوگ اغراض کی بنا پر سدّ راہ بنے ہوئے ہیں وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری چلتی ہوئی گاڑی ان کے روکے نہ رک سکے گی۔

یہ پروگرام اگر اختیار کرنا، ہوتو پھر ''آمین بالجہر'' اور تیجے اور قل کے جھگڑے کو ختم کیجیے۔ غور تو کیجیے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لیے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصب العین بس اتنا ہی کچھ ہے؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ اُن مہماتِ امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی جن کے لیے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مظالم کا تختۂ مشق بنتے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھادی گئی ہے اقامت دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ فکر تو اس کی کیجیے کہ لوگ خدا کی دین کو بہ رضا و رغبت تسلیم کریں اور سنتِ نبویہ کا اتباع کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ چیزیں پیدا ہوگئی تو پھر جس کو جو چیز کتاب وسنت سے ثابت ہوتی نظر آئے گی وہ اسے اختیار کرلے گا۔ اور جس کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہ ملے گا اسے ترک کردے گا۔ زور تو اسی ایک بنیادی اصلاح پر دینا چاہیے۔ اصول سے فروع کی طرف لے چلنے کی جو تدریج اسوۂ نبوی میں پائی جاتی ہے اسے اگر نظر انداز کرکے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کردیا جائے تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہوگا، اسوۂ نبوی کا اتباع نہ ہوگا۔

دورِ اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم خرابیاں نہیں تھیں جتنی آج ہمارے دور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت سب پر چوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا اصلاح کی وادی کو ایک ہی جست میں طے کرڈالا گیا؟ نہیں، بلکہ اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئی، پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی، پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو دھونے کا سلسلہ بتدریج کئی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نبی کے طریقِ کار کو خوب سمجھ لیجیے، پھر آگے قدم بڑھایئے۔

ایک اور چیز میں نے یہ محسوس کی ہے کہ ہمارے رفقاء میں کام کو مبالغہ سے پیش کرنے کا جذبہ بھی کبھی کبھی پیدا ہوجاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جذبہ کو ختم کردیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ اپنی کارگزاری بتانے میں مبالغہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ اپنی جگہ اپنے کام کو تسلی بخش بھی نہ سمجھا جائے۔ بہتر سے بہتر طریقہ پر کام کرلینے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوجایئے۔ اور اس کے اچھے پہلوؤں پر قانع ہونے کے بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو دیکھ دیکھ کر بے چین رہیے۔ جو کام صحیح ہوا ہو اس پر خدا کا شکر بجالایئے اور جو کمی رہ گئی ہو اسے دور کرنے کی توفیق بھی اس سے طلب کیجیے۔

پھر مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ دوسری جماعتوں کے لوگوں میں کام کرتے وقت آپ پر مناظرہ کی روح چھا جاتی ہے۔ اور مفاخرت اور مکابرت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بہت اچھا ہے اور اگر درحقیقت یہ شبہ صحیح ہے تو ان بلاؤں سے نجات حاصل کیجیے۔

اس سلسلے میں اپنے طرزِ عمل اور اپنے اندازِ گفتار سے دوسری جماعتوں پر یہ واضح کر دیجیے کہ ہم کسی سے جماعتی کشمکش نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے اور ہمارا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ جو بھی حق سے منحرف ہے ہم بس اس کی غلطی کو صاف بتا دیں گے اس کے بعد ہمارا خاص طور پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہوگا۔ بہر حال کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ آپ اس کے حریف بن کر اٹھے ہیں۔ ہمیں تو صرف نظامِ کفر و جاہلیت کا حریف بن کر رہنا ہے۔ اسی سے مقابلہ کرنا ہے اور اس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہوگی اسی تناسب سے ہماری اس دشمنی میں بھی شدت ہوگی۔

بعض اصحاب کی طرف سے پوچھا گیا ہے کہ آیا ہم ان جلسوں اور تقریبات میں شریک ہو کر تقریر کر سکتے ہیں جو عام انجمنوں کی طرف سے منعقد ہوا کرتی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ہمیں اس ذریعہ سے اپنے خیالات کو پھیلانے کے مواقع ملتے ہیں، مگر میرا مشاہدہ ہے کہ یہ طریق کار مفید نہیں ہے۔ ایک اسٹیج پر جب قسم قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور انھیں کے دوران میں ہماری دعوت بھی پیش کی جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ان بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ہمیں خوش کرنے کے لیے سنائی جاتی ہے یا یہ جلسہ ایک دماغی دستر خوان ہے جس پر جہاں اور طرح طرح کے مربے اور اچار رکھے ہیں وہاں ایک نئی قسم کا یہ اچار بھی رکھ دیا گیا ہے۔ انجمن بازی کے نقار خانہ میں اگر بالفرض آپ نے بوجوہ احسن اپنا پیغام پیش کر دیا تب بھی نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ لوگ داد دیتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ فلاں صاحب خوب بولے۔ ہماری قوم کا حال آج کل اس بگڑے ہوئے رئیس کا سا ہو گیا ہے، جس کے گرد و پیش بہت سے خوشامدی رئیس لگے ہوئے ہوں اور اسے خوش کرنے میں منہمک ہوں، ان خوشامدیوں کے زمرے میں شامل ہو کر آپ حکمتِ دین اور حقائقِ زندگی کو خواہ کتنی ہی سنجیدگی سے پیش کریں، بہر حال یہ رئیس المزاج قوم آپ کی باتیں انھی کانوں سے سنے گی جن سے وہ دوسرے مصاحبوں کی باتیں سنتی ہے۔ ان وجوہ سے میں جماعت کے مقررین کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے اپنی انفرادیت یا دوسرے لفظوں میں

اپنی امتیازی حیثیت کو خوب مستحکم کر لیجیے اور بالکل جداگانہ طور پر اپنے نظریات پیش کرتے رہیے۔ البتہ اگر یہ ممکن ہو کہ مارکیٹ میں جو خوش تقریر ریکارڈ خوب مقبول ہیں ان کے اندر آپ اپنا نغمہ بھر سکیں تو یہ صورت مفید ثابت ہوگی۔ مختلف لیڈروں اور مقرروں پر آپ اپنا اثر اس حد تک پھیلا دیجیے کہ ان کی تقریروں میں خواہ مخواہ آپ ہی کے خیالات آنے لگیں۔ جب وہ کچھ عرصہ تک محض قولاً ہمارے نظریات کو بیان کرتے رہیں گے تو بعید نہیں کہ ایک روز انھیں اپنے ضمیر کی آواز اور رائے عام کے دباؤ سے اپنی عملی روش کو بھی بدلنا پڑے گا۔ یہ اسکیم اگر خوب وسعت کے ساتھ عمل میں لائی جائے تو آخر کار اجرت پر تقریر کرنے والے مقررین جنھوں نے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رکھا ہے اسٹیج سے ہٹا دیے جائیں گے اور کام کے آدمیوں کو پبلک خود سامنے لے آئے گی۔

یہ معلوم کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی کہ آپ حضرات جا بجا اپنے نظریات کو پھیلانے کے لیے مدارس قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو عملاً قدم اٹھ چکا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ احتیاط ضرور کیجیے کہ ایک مدرسہ کو چلانا بجائے خود مقصد بن کر نہ رہ جائے۔ ہمیں تعلیم کو حصول مقصد کے ذریعہ کی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔ جہاں محسوس ہو کہ آپ کا مدرسہ مقصد کی جگہ لے رہا ہے یا مقصد میں رکاوٹ بن رہا ہے تو ایسے مدرسے کو مسمار کر دیجیے اور اس کے کھنڈروں کو روندتے ہوئے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھیے۔ اس غرض کے لیے نصب العین کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک قوم نے جو کارخانے خود جنگی اغراض کے لیے کروڑوں روپے کے صرف سے بنائے ہوتے ہیں انھیں جب وہ اصل مقصد کی راہ میں رکاوٹ بنتے دیکھتی ہے تو خود اپنے ہاتھوں سے انھیں تباہ کر دیتی ہے۔ اسی جنگ میں روس نے اپنے بے شمار صنعتی مراکز کو اور فرانس نے اپنے بحری بیڑے کو تباہ کر دیا۔ یہ انتباہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ پہلے بھی ہمارے تعلیمی کام کرنے والے بہت سے بزرگوں سے یہی لغزش ہو چکی ہے۔ یعنی انھوں نے مدرسے چلانے کو ذریعہ کے بجائے مقصد کی حیثیت دے دی۔ آپ لوگ اس سلسلہ میں بہت احتیاط سے کام لیں۔

اب رہا مقامی کام اور تنظیم کے استحکام کا سوال، سو اس غرض کے لیے میں چند موٹی موٹی باتوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔

سب سے پہلی توجہ طلب چیز یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقہ کے ارکان میں مالی ایثار کے

جذبہ کو ابھاریئے۔ اب تک دوسرے مختلف جذبات تو تناسب سے کچھ زیادہ ہی ابھرے ہیں مگر مالی ایثار کے جذبہ کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ ہاں اس ضمن میں یہ بات ضرور ملحوظ رہے کہ اس جذبہ کی اساس اخلاقی ذمے داری کے احساس پر ہونی چاہیے، ضوابط سے یہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہر شخص کو یہ سوچنا چاہیے کہ جب وہ مسلمان ہوا ہے تو اس کے مال کو بھی مسلمان ہونا چاہیے۔ جسم اور جان مسلمان ہوجائیں اور مال مسلمان نہ ہوتو اسلام کا اقتضاء پورا نہیں ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ اپنے مال کو بھی دائرۂ اسلام میں لائیے اور اس کی شکل یہی ہے کہ اپنے کمزور بھائیوں کی دست گیری اور اپنے بیت المال کی تقویت میں اسے صرف کیجیے۔ "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً " کا مدّعا یہی ہے۔ پھر جذبۂ ایثار کی پیمائش اللہ کی راہ میں صرف کیے جانے والے مال کی مقدار سے نہیں ہوتی بلکہ ان تکلیف دہ حالات سے ہوتی ہے جن کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک شخص انفاق کرتا ہے۔ اس لحاظ سے بعض اوقات ایک پیسہ ایک ہزار روپیہ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ خدا کے ہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دیا کتنا بلکہ یہ کہ کن مشکلات کے ہوتے ہوئے دیا۔

دوسری چیز جس کا شدید پابندی سے اہتمام ہونا چاہیے، ہفتہ وار اجتماع ہے۔ مختلف مقامات پر جماعتی نظام مرجانے کی وجہ یہی تھی کہ افراد کو مجتمع رکھنے اور جماعت کے ساتھ ان کی عملی دلچسپی کو زندہ رکھنے والے اس رشتہ کی اہمیت کو نظر انداز کردیا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں آئندہ نرمی سے کام نہ لیا جائے ہر جگہ کے تمام مقامی ارکان کو ہفتہ وار اجتماع کی شرکت کا لازماً پابند ہونا چاہیے۔ جو رکن کسی وجہ سے شرکت نہ کرسکے وہ اپنی غیر حاضری کے لیے معقول عذر اپنے امیر کے سامنے پیش کرے۔ اگر کسی کی طرف سے غلط معذرت پیش ہوگی تو آخر حقیقت کھل ہی جائے گی۔ نیز جو رکن بلا عذر یا غیر اہم عذرات کی بناپر مسلسل چار ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہ ہو، یا ایک طویل مدت تک بیچ بیچ میں اکثر ناغا کرتا رہے تو اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ نظام جماعت کی پابندیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ہفتہ وار مقامی اجتماع کے علاوہ جہاں ایک ضلع میں یا قریب کے اضلاع میں متعدد ارکان موجود ہوں وہاں باہمی صلاح ومشورے سے وقت اور مقام کا تعین کرکے ہر دوسرے تیسرے مہینے اجتماعات منعقد ہوتے رہنے چاہئیں جن کا پروگرام ان ہدایات کی روشنی میں مرتب کرلیا جائے جو میں نے اجتماع دربھنگہ کے موقع پر ہفتہ وار اجتماعات کے لیے دی تھیں۔

خصوصیت کے ساتھ جن علاقوں کے بیشتر ارکان مختلف دیہات اور شہروں میں منفرد ہوں وہاں تو اس طرح کے سہ ماہی یا دو ماہی اجتماعات بہت ضروری ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ منتشر ارکان آخر کار ضائع ہو جائیں گے۔

علاوہ بریں اپنے آپ کو مرکز سے وابستہ رکھنے میں غفلت نہ برتیے، اس وابستگی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ خطوط کے ذریعہ سے مجھے ہر پہلو سے مقامی حالات اور کام کی رفتار کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتے رہیے۔ مگر اس کا خیال رکھیے کہ چونکہ میرے پاس کوئی سکریٹریٹ نہیں ہے اس لیے کثرت سے جواب طلب خطوط نہیں آنے چاہئیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کام کی رپورٹ مرکز پہنچتی رہے۔ یعنی جماعت کس حال میں ہے، کہیں سستی کا دور دورہ تو شروع نہیں ہو گیا، کہیں نظامِ کار کی مشینری میں کوئی نقص تو نہیں پیدا ہو گیا، کہیں کوئی داخلی و خارجی فتنہ تو نہیں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے حالات میں اصلاحِ احوال کے لیے مرکز ہر ضروری امداد بہم پہنچائے گا۔ اگر قیم جماعت کے فرائض ادا کرنے کے لیے مجھے کوئی مناسب آدمی مل گیا تو وہ دورہ کر کے مرکز کی طرف سے کام کی نگرانی بھی کرتا رہے گا۔ جب تک یہ صورت پیدا نہ ہو آپ لوگ خود آپس میں بھی مربوط رہیں اور وقتاً فوقتاً مرکز میں آکر چند روز بسر کرتے رہیں۔ آگے چل کر جب تربیتی مرکز قائم ہو گیا تو پھر مقامی جماعتوں کے امراء اور دوسرے سمجھ دار ارکان یہاں آکر بہت زیادہ استفادہ کر سکیں گے۔

کپورتھلہ کی جماعت تعلیم بالغان کی جو اسکیم عمل میں لا رہی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ یہ کام ہر جگہ شروع ہو جانا چاہیے۔ اس سے ایک تو اللہ کی راہ میں باقاعدہ طور پر وقت کی قربانی کرنے کی عادت پڑ جائے گی، دوسرے عوام سے آپ کا براہ راست رابطہ ترقی کرے گا۔ اور آپ ان سے براہ راست خطاب کے مواقع حاصل کر لیں گے۔ نیز آپ تعلیم کو پھیلا کر اپنے لٹریچر کو پھیلانے اور پیغام کو فروغ دینے کے لیے بہت وسیع میدان تیار کر لیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ جو لوگ بھی آپ کی اس بلا معاوضہ خدمت سے فائدہ اٹھائیں گے وہ آپ کے اخلاق سے اتنے متاثر ہو جائیں گے کہ نہایت آسانی سے آپ کی بات ان کے دلوں میں اتر جائے گی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ آپ صرف اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ہماری تحریک کے پھیلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس ملک کے عوام کی جہالت ہے۔ دوسرے ممالک میں تعلیم کے عام

ہونے کی وجہ سے یہ حال ہے کہ ایک کتاب ادھر پریس سے نکلی اور ادھر بسا اوقات ایک ہفتہ میں پچاس لاکھ آدمیوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ خواندگی کی وجہ سے خیالات کے پھیلنے میں سرعت کتنی پیدا ہوجاتی ہے۔ بخلاف اس کے ہمیں اپنے نظریات کو لوگوں تک پہنچانے میں بہت دیر لگتی ہے۔ اور برسوں کی کوششوں کے باوجود آبادی کے ایک بہت ہی قلیل حصے کو خیالات سے متاثر کیا جاسکتا ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے میں جہاں تک ممکن ہو ہمیں مساعی صرف کرنی چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر آدمی یہی کام کرے، نہیں، صرف وہ رفقاء اس نازک کام کا بار اٹھائیں جو تعلیم بالغان کے لیے ضروری صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس سلسلہ میں جو لٹریچر شائع کیا ہے اس سے فائدہ اٹھایئے اور جہاں کہیں بھی اس میں سمیّت پائی جاتی ہو، اس سے بچتے ہوئے کام لیجیے۔ خصوصیت کے ساتھ تعلیم بالغان کا فن ان کے لٹریچر سے سیکھنے کی کوشش کیجیے۔ پھر جوں جوں آپ عملاً کام کرتے جائیں گے تجربات سے آپ کی صلاحیتیں چمکتی جائیں گی اور رفتار کار بڑھتی جائے گی۔ خدا کرے کہ آپ اپنے مقاصد حسنہ میں کامیاب ہوں۔

خاتمہ

آخری نشست کے ختم ہونے پر بیشتر لوگ پہلی گاڑی سے روانہ ہوگئے۔ اور صرف وہ چند حضرات کچھ وقت کے لیے ٹھہر گئے جنھیں جناب امیر نے خود کسی مشورت کے لیے ٹھہرالیا تھا یا جنھیں اپنے متعلق کچھ ہدایات حاصل کرنی تھیں۔

جہاں تک اجتماع کے مصارف کا تعلق ہے ہمارے یہاں آرائش و تکلفات کے سلسلہ کے فضول مصارف سرے سے ہوئے ہی نہیں۔ رہیں ضروریاتِ قیام و طعام سو اُن پر بھی ناگزیر حد تک خرچ کیا گیا۔ ڈیڑھ سو افراد کے قیام اور شش وقتہ طعام و ناشتہ پر اس گرانی کے زمانہ میں ہماری لاگت چار سو روپیہ کے لگ بھگ رہی۔ یہ سارا بار جماعت کے محدود بیت المال پر ڈالا گیا تھا کیونکہ چندہ کی اپیلیں کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ مگر بغیر کسی اپیل کے شرکاءِ اجتماع نے محض اپنی فرض شناسی اور احساس ذمے داری کے ماتحت اجتماع کے دنوں میں جو رقم بیت المال میں داخل کرائیں ان کا مجموعہ مصارفِ اجتماع سے بہت زیادہ تھا۔

نوٹ: اس کتاب میں سے ''معذرت'' اور ''حساب آمد و خرچ ۱۹۴۳ء'' حذف کردیے گئے ہیں۔